

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224439

UNIVERSAL
LIBRARY

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۱۶۳

ہماری ریلیں اور سڑکیں

[ہندستان کے ذرائع نقل و پزیری پر ایک علمی تبصرہ]

از
ڈاکٹر جعفر حسن

• شایع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) - دہلی

قیمت ۴۰

• مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی •

۱۹۴۱ء

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو [ہند] نمبر ۱۲

ہماری تین اور سترین

[ہندستان کے ذرائع نقل پزیری پر ایک علمی تبصرہ]

ڈاکٹر جعفر حسن

”اُستاد عمرانیات جامعہ عثمانیہ“

شایع کردہ

انجمن ترقی اُردو [ہند] دہلی

ہماری ریلیں اور سڑکیں

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	ہماری سڑکیں	۱
۲	ہماری آب راہیں	۲۰
۳	ریل کی ایجاد، رواج اور ترقی	۳۱
۴	ہندستان میں ریلوں کی سرگزشت	۳۸
	ہندستان میں ریلوں کی موجودہ کیفیت	۵۵
۵	ہمارے ہوائی راستے	۶۷
۶	جدید ذرائع نقل و حمل کی اہمیت	۷۳
۷	جدید ذرائع نقل پذیری کے معاشی اثرات	۸۳
۸	ریلوں کا تاریک پہلو	۹۸
۹	شماریات نقل پذیری	۱۰۵
	(i) ابتدائی تقابلی اعداد	۱۰۷
	(ii) جدید وضع کی بے گردی سڑکیں	۱۰۹
	(iii) سرکاری ریلوں کی مالی سرگزشت اور سرکاری ریلوں کا مالی تجزیہ	۱۱۰

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۱۱۴	(۱۷) ہندستانی ریلوں کے پیچیدہ مسئلے	
۱۱۴	(۱) مختلف پٹریوں کا مسئلہ	
۱۱۵	(ب) مختلف ملکیتوں کا مسئلہ	
۱۱۵	(ج) مسافروں کے درجہ واری اعداد	
۱۱۷	(د) ہندستانی ریلوں میں یورپنیوں کی تعداد	
	ضمیمے	۱۰
۱۲۱	(۱) جدید ذرائع نقل پزیری کی تاریخی سرگزشت	
۱۲۵	(۱۱) ریلوے ادب	



ہماری ریلیں اور سڑکیں

پہلا باب

ہماری سڑکیں

ہندستان میں آنے جانے اور بار برداری کے جو ذریعے ہیں قدیم ترین زمانے سے بنڈیوں اور چھکڑوں کا رواج چلا آ رہا ہے اور آج بھی میکانی ترقیوں کے باوجود یعنی موٹروں اور لاریوں، ریلوں اور ہوائی جہازوں کے ہوتے ہوئے بھی پٹیلے اور چھکڑے ہماری معاشی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو عموماً شہروں میں رہتے ہیں اور کاروباری یا خانگی اغراض کے تحت ایک مقام سے دوسرے مقام تک ریل یا موٹر، بس یا لاری کے ذریعے سفر کرتے ہیں بیل گاڑیوں کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے مگر یہ حقیقت ہے کہ بڑے بڑے شہر سے لے کر معمولی سے معمولی گاؤں اور کھیرے میں پختہ اور کچی، شہری اور دیہاتی ہر سڑک پر پٹیلے، چھکڑے اور پہلیاں نظر آتی ہیں۔

کچی سڑکوں اور دوڑنا وہ گاؤں میں اُن کی تنہا عمل داری ہے اور دیہات کی

سماجی اور معاشی زندگی پر ان کی حکمرانی بدستور قائم ہے۔ مال کی منتقلی ہوتی ہے تو کل مال چھکڑوں پر لادنا پڑتا ہے، بارائیں ہیں تو چھکڑوں پر جا رہی ہیں۔ عوس یا جائز میں شرکت کرنی ہے تو چھکڑوں کی سواری ہے، میلوں کو جانا ہے تو وہی چھکڑے حاضر ہیں۔ آغاز تمدن سے لے کر اب تک اور آئندہ نہ جانے کتنے برسوں تک یہ ہندستان میں آمد و رفت اور نقل و حمل کا اہم ترین ذریعہ ہیں اور رہیں گے۔ انسانی زندگی کے بالکل ابتدائی فزور میں ظاہر ہے کہ انسان کے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ وہ پیدل آتا جاتا تھا۔ جو کچھ بھی اُسے لانا لے جانا ہوتا تھا وہ اپنے کندھے پر لاد کر یا سر پر اٹھا کر لاتا لے جاتا تھا۔ جب اُس نے جانوروں کا پالنا سیکھا اور پالتو جانوروں کو رکھنے کا رواج بڑھ گیا تو اُس نے بار برداری یا سواری کے لئے جانوروں کو استعمال کرنا شروع کیا جس کا رواج اب بھی خاص کر ہمارے ملک میں عام ہے۔ بنجاروں کا مانڈا آتا ہے تو ہریل غلے سے لدا ہوتا ہے، تعمیر کے لئے اینٹ اور ریت، چونا اور مٹی آرہی ہے تو گدھوں پر لدی ہوئی، کوئی گھوڑے پر بیٹھا سرپٹ چلا جا رہا ہے کوئی اونٹ پر سوار ہچکچے کھاتا چلا آ رہا ہے اور کسی راجہ ہمارا جہ کی شان بڑھانے کے لئے باہمی بھی جھومتا چلا آ رہا ہے۔ غرض شروع شروع میں پالتو جانور ہی بار برداری اور سواری کے لئے استعمال ہوتے تھے اور پھر اس کے کوئی چارہ ہی نہ تھا کیونکہ اس زمانہ میں ہڑکوں کا وجود ہی نہیں تھا۔ راستہ چلتے چلتے ٹیڑھی ٹیڑھی پگ ڈنڈیاں بن جاتی تھیں۔ بس پر سے انسان اور حیوان یکے بعد دیگرے گزرتے تھے۔ بعض مرتبہ ایک کے پیچھے ایک چلنے والوں کی لمبی قطار ہو جاتی تھی۔

جب دُور دراز مقاموں کا سفر کرنا ہوتا تھا تب بھی یہی حال تھا۔ پیدلوں اور سواروں، اونٹوں اور گھوڑوں، میلوں اور خچروں کی لمبی لمبی قطاریں مافلہ سالار کی

نگرانی اور مسلح سپاہیوں کی حفاظت میں چلی جاتی تھیں۔ اس قسم کے قاتلوں کو کاروان بھی کہتے ہیں۔ کاروانوں کے ساتھ سفر کرنے والے صبح تر کے کوچ کر جاتے تھے اور دوپہر کے وقت ایک دو گھنٹے کسی پڑاؤ پر ٹھہر کے شام ہوتے ہوتے کسی ایسے مقام تک پہنچ جاتے تھے جہاں کارواں سراسے ہوتی تھی اور لوگ آرام سے رات گزار سکتے تھے۔

جہاں کہیں مغربیت اور مکائیت کا سیلاب نہیں پہنچا، لوگ اسی طرح سفر کرتے ہیں، وہ منظر بہت ہی خوشنما ہوتا ہے جب کوئی بخاروں کا ٹانڈا کسی پہاڑی پر چڑھتا اُترتا ہے، بیلوں کی گھنٹیاں کانوں کو بڑی بجلی لگتی ہیں۔ اسی طرح غروب آفتاب کے پس منظر میں اونٹوں کے کاروان کو دیکھ کر وجدانی سرور پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ فزون وسطیٰ اور عہد قدیم کی اکثر یادگاری چیزوں میں رومانیت اور خوش نمائی پائی جاتی ہے جس کا لغم البدل جدید تہذیب میں نہیں مل سکتا۔ غرض صدیوں اسی طرح پاک ڈنڈیوں اور کاروانوں، قاتلوں اور ٹانڈوں کے ذریعے سفر ہوتا رہا، جیسے جیسے آمد و رفت میں اضافہ ہوتا گیا پاک ڈنڈی وسیع ہوتی گئی، قدرت کا یہ اہل قانون ہے کہ ہر ملک میں درد مند لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ خوش بختی سے جب ایسا ہی کوئی شخص حاکم یا سردار بن جاتا تھا تو وہ اپنے زیر اثر علاقوں کو بہتر بنانے کے لئے ان پاک ڈنڈیوں کو ہموار، وسیع اور صاف کروا دیتا تھا غرض راستے خود بخود پڑتے تھے اور تھوڑی سی حکمت و محنت سے آمد و رفت کی وجہ سے وسیع ہو کر سڑک بنابن جاتے تھے۔

جب انسان نے ٹھیلے بنائے اور اس میں پہنے لگائے تو اس کو بڑی سہولت ہوئی، بار برداری آسان اور منتقلی کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ جس قدر وزن وہ اٹھا سکتا ہے، اُس سے زیادہ وزن وہ گھسیٹ سکتا ہے اور جس قدر وزن وہ

گھسیٹ سکتا ہو اس سے کئی گنا زیادہ وہ بہت دُور تک پہنچوں اور گاڑی پر کھڑک ڈھکیل سکتا ہو۔ اس غیر شعوری دریافت اور انکشاف سے اُس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور شروع میں خالص لکڑی کے چھکڑے بنائے جو آج بھی استعمال ہوتے ہیں آپ نے جنگل کے قریب کی بستیوں میں دیکھا ہوگا کہ بعض قدیم قبیلے جنگل کی لکڑی بیچ کر اپنی گزربسر کرتے ہیں اس غرض کے لئے انھیں جو لکڑی جنگل سے لانی پڑتی ہو وہ انھیں خالص لکڑی کے بنے ہوئے چھکڑوں پر لائی جاتی ہو۔ اس قسم کے چھکڑوں کا استعمال لمباڑے اور دوڑ کھلانے والے دکن کے قبیلوں میں اب بھی رائج ہو۔ ہمارے ملک میں بہت لوگ اب تک اتنے غریب ہیں جو پہیوں کے اوپر لگانے کے لئے لوہے کی پٹی اور چھکڑے کا وزن تھامنے کے لئے لوہے کا دھرا بھی نہیں خرید سکتے، اُن کے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں کہ وہ چربی خرید کر پہیوں میں لگائیں لہذا انھیں مجبوراً ایسے چھکڑے بنانے پڑتے ہیں جو صرف لکڑی سے بنائے جاتے ہیں۔ شہریوں کے کانوں کے نازک پردے ان کے پہیوں کی آوازوں کو بھی مشکل برداشت کرتے ہیں۔ لیکن جنگل کی لکڑی کسی قدر کم قیمت پر مل جاتی ہو، چار چھ آنے فی بندھی شہریوں کا فائدہ ہو جاتا ہو لہذا وہ اس ناگوار آواز کو بھی بھگت لیتے ہیں بعض کو زندگی کا سہارا مل جاتا ہو اور بعض کو تھوڑا سا فائدہ ہو جاتا ہو۔ غرض ٹھیلے اور چھکڑے صدیوں سے چل رہے ہیں اور یہی لیل و نہار رہے تو صدیوں تک چلتے رہیں گے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہو کہ پہلے پہل پیدل پھر سواری اور باربرواری کے لیے لا دو جانوروں کا رواج ہوا اس کے بعد ٹھیلے بنے اور ٹھیلوں کے بعد چھکڑے! جیسے جیسے چھکڑوں کا رواج بڑھتا گیا راستے کشادہ ہوئے اور کہیں کہیں ان راستوں سے ایسے پتھروں کو ہٹانا پڑا جن کی وجہ سے راستہ ناقابل گزر

ہو جاتا تھا یا کوئی اور راستہ اُن کو اختیار کرنا ممکن نہ تھا گویا راستوں کی توسیع کے ساتھ ساتھ اُن کو کسی قدر سطح بھی بنایا گیا۔ لیکن جیسا کہ اب بھی گاؤں کھڑوں یا نئی بستیوں کے قریب دیکھنے میں آتا، جو عجیب بات ہو کہ اول چھکڑے چلنے لگتے ہیں پھر سڑک بنتی ہو۔ بظاہر یہ الٹی بات ہو مگر بالکل صحیح ہو ذرا غور کر کے دیکھئے کہ شروع شروع میں کس طرح سڑکیں بنیں۔ چھکڑے والے کو کہیں جانا ہوا اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے میڑھا تر چھا جانے آنے کا راستہ نکال لیا۔ کہیں کوئی پتھر حایل رہا اور قریب میں اور راستہ نکالنا نامکن ہوا تو اُس نے دو چار کی مدد سے صرف اس ناقابل گزر پتھر کو راستے سے ہٹا دیا، کہیں چھکڑے کا پہیہ ملازم زمین میں دھنس گیا اُس نے چار پانچ چھوٹے بڑے پتھر پہیے کے نیچے ڈال دیے اور اپنے یاروں کی مدد سے پہیے کو گھمایا لیجیے چھکڑا دلدل سے نکل گیا اور ”راستہ“ بن گیا۔ اسی قسم کے بیسیوں راستے آہستہ آہستہ ترقی کر کے شاہ راہ بن جاتے ہیں اور حقیقت میں بن چکے ہیں گو ایسے ابتدائی راستے سے شاہ راہ تک ترقی کرنے کے لیے مدتوں اور بعض صورتوں میں سیکڑوں برس لگتے ہیں۔

ہوتا یہ ہو کہ کوئی قبیلہ کا سردار اپنے ذاتی اثر کو کام میں لا کر غلاموں اور بے بسوں کے بیگار سے کچا پکا راستہ بنوا دیتا ہو جس کی حرمت شدید ترین ضرورت کے تحت کی جاتی ہو۔ بارش کے زمانے میں اس قسم کے راستے بعض مقاموں پر دلدل بن کر ناقابل گزر ہو جاتے ہیں تو ہفتوں آمد و رفت رُک جاتی ہو یا راستے قابل گزر ہوں مگر شدید بارش کی وجہ سے ندی نالوں میں پانی زوروں سے گزر رہا ہو یا بڑی ندیوں میں پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے ناؤ کا چلنا دشوار یا خطرناک ہو تو سواریاں اور قافلے، ٹانڈے اور کاروان اپنی اپنی جگہ اُٹکے پڑے سہتے ہیں

پُل اور سرائے بہت بعد میں تعمیر ہوئے اور آج بھی کتنے کتنے ایسے ہمارے ملک میں موجود ہیں جہاں کے راستے اسی قدیم ترین زمانہ وحشت کی یادگار ہیں۔ بڑے بڑے شہروں کے لئے بے گردی سڑکیں اور نہ زمین موریوں بن رہی ہیں اور اُن بیچاروں کے لیے مذی نالوں پر پُل بھی نہیں۔

زمانہ گزرتا گیا تہذیب و تمدن میں انسان نے اتنی ترقی کی کہ بڑی بڑی ریاستیں وجود میں آئیں راجا پر جا کے حقوق اور فرائض کا احساس دلوں میں پیدا ہونے لگا، مفکروں نے حاکموں اور محکوموں کے باہمی تعلقات کے متعلق نظریے بیان کیے، سیاست و ریاست سے دلچسپی لینے والوں نے خیال آرا سیاں کیں، اخلاقیات اور دینیات، معاشیات اور عمرانیات کے زاویہ نگاہ سے حکومت اور حاکمیت پر تبصرے شروع ہوئے۔ راج اور راجا پر تنقید کا آغاز ہوا۔ علمی ترقی کے ساتھ ساتھ مذہب اور ایمان کا درس دینے والے، شرافت اور بھلناہٹ کی تلقین کرنے والے پیدا ہونے لگے اور جان وادوں پر ترس کھانے والے، رعایا سے محبت کرنے والے، خود کو ملک کا خادم سمجھنے والے حاکم بہ سراقہ اتر آنے لگے انھیں لوٹ کھسوٹ سے نفرت تھی، تن پروری اور نفس پرستی، خود غرضی اور ظاہر داری اُن کی طبیعت ہی میں نہ تھی، اپنے ملک میں رہنے بسنے والوں سے انھیں سچی بہادری تھی، اور رہ رہ کر اُن کے دل میں خدمت خلق کی امنگ اٹھتی تھی۔

ان پاک جذبوں سے متاثر ہو کر نیک نفس انسانوں نے نہ صرف ان گنت عمدہ کام انجام دیے بلکہ پختہ سڑکیں بنوائیں، کنوئیں کھدوائیں، پُرانی باولیاں کو درست کیا، راستوں پر مسافت کے نشان نصب کئے اور جابجا مسافر خانے اور سرائیں بنوائیں۔ جہاں جہاں ممکن ہوا دو طرفہ سایہ دار درخت لگوائے اور سب سے بڑی بات یہ کہ عام نظم و نسق کے معیار کو بلند کر کے راستوں کو

اتنا محفوظ کیا کہ چوروں، لیٹروں اور ڈکیتوں سے کم سے کم کاروانوں اور قافلوں کو نجات مل گئی۔ معتبر افراد کاروانوں کی قافلہ ساری کے لیے منتخب کے گئے۔ ہر پڑاؤ پر کھانے پینے، رہنے پہنے اور دوا درمن کے معقول انتظامات کے گئے۔ مختلف ملکوں نے مختلف زمانوں میں یہ اعلیٰ معیار حاصل کیا تھا مگر یہ حقیقت ہو کہ ہزاروں سال قبل ہی چین اور مصر میں، شام و عرب میں، یونان و روم میں اور خود ہمارے ملک ہندستان میں خوش انتظامی سے شہر اور شہریوں کی طرح رہیں اور راہرو عمدہ حالت اور امن و عافیت میں تھے۔

مولانا حالی نے اپنے مشہور مسدس میں جو کچھ سڑکوں کے متعلق لکھا ہے وہ لفظ بلفظ نہ ہی اصل مہنوم کی حد تک ہر قدیم متمدن ملک پر صادق آتا ہے۔ کیونکہ متذکرہ ملکوں کے قدیم باشندوں نے سڑکوں کے انتظام میں قابل فخر معیار حاصل کیا تھا۔ ان لوگوں نے واقعی

کیا جائے آباد ہر ملک ویراں دیا کیے سب کی راحت کے ساہ
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں انھیں کردیلر شب صحن گلشاں
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے

یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے
یہ ہمارے سڑکیں یہ راہیں مصفا دو طرفہ برابر درختوں کا سایا
نشاں جا بجا میل و فرسخ کے برپا سررہ کوئیں اور سرائیں ہمایا
انھیں کے ہیں سب نے یہ چربے آٹاے
اسی قافلے کے نشاں ہیں یہ سارے

ہمارے ملک میں سب سے پہلے جس حاکم نے راستوں کی تعمیر کی طرف توجہ کی وہ ہمارا جہ اشوک اعظم ہیں۔ شاہراہوں کی اعلیٰ تنظیم نیز مسافروں اور جانوروں

کے آرام کے لیے آج سے ۲۳ صدیوں کے قبل اشوک نے جو کچھ کیا :
کچھ نہ کچھ ذکر تاریخ ہند کی ہر مستند اور اہم کتاب میں ملتا ہو مثلاً دہلوی
نے لکھا ہے :-

”راج دھانی اور صوبوں کے درمیان جل راہوں اور سڑکوں کے ذریعے تعلق قائم
رکھا جاتا تھا۔ اہم ترین سڑک وہ شاہ راہ تھی جو پتالی پور سے دریائے اندس
تک نکلیا سے ہوتی جاتی تھی اور لاہور ڈیوڑی کی بنوائی ہوئی ”گراند ٹرنک روڈ“
کی پیش رو تھی۔

فاصلوں کو ظاہر کرنے کے لئے ہر دس دس ستادیا، یا آدھے کوس کے
بعد کھمبے بنوائے گئے۔ ہر کھمبے کے قریب اشوک نے ایک باؤلی بنوائی اور
راستوں پر فخر آدر اور سایہ دار درخت لگا کر مسافروں کے آرام کا مزید خیال کیا
آرام گاہیں اور گھوڑے بنوائے جہاں پہنے کا پانی بھی میسر آتا تھا۔

راستے اور مواصلت کے ذریعے اتنے اچھے رہے ہوں گے کہ پتالی پور تھیں
دور افتادہ راج دھانی سے ساری ملک کو سنبھالنے کا امکان پیدا ہوا۔“

اشوک اعظم کے دادا چندر گپت مودیا کے مشہور وزیر چنکیا یا کوٹلیا نے
شاہنامی مشہور کتاب لکھی ہے اس میں راستوں کی تعمیر اور مرمت کو باد
فرائض میں داخل کیا ہے ۶۰۰ سال بعد جب چین کا مشہور سیاح فاہین ہن
آیا تھا تو اس نے شاہراہوں کو اچھی حالت میں پایا تھا! فاہین کے دو صاحب
ہیون تسانگ مشہور چینی جاتری ہندستان آیا تھا اس نے بھی تصدیق کر

۱۰ دہلوی : Asoka : The Buddhist Emperor of India. آکسورہ ۱۹۰۹ء

۱۱ یہ کتاب تین سو سال قبل مسیح لکھی گئی اور سیاست اور معیشت کے متعلق قدیم ہندو
سب سے زیادہ اہم کتاب ہے :-

اس زمانے میں ہندستان کی شاہراہوں کی حالت عمدہ تھی۔ ہمیں یہ باور کرنے میں ذرا بھی تاثر نہیں کہ ان چینی جاتیوں کے بیانات خوش اعتقاد ہی پر مبنی نہیں ہیں، کیونکہ اس زمانے میں ہندستان کا عام تمدن اور نظم و نسق کا معیار بہت بلند تھا۔ علم و ہنر ترقی کر رہے تھے جو زمانہ علم و ہنر کی قدر کر سکتا ہو کیا وہ زندگی کی ضرورتوں کو فراموش کر سکتا ہو؟۔

جس طرح جہاں راجہ اشوک اور ان کے جانشینوں نے ہر جہتی فلاح و بہبود کی خاطر فائدہ مند انتظامات کئے اور اس ضمن میں سڑکوں اور ہنروں کی تعمیر کرائی اسی طرح بنگال اور میسور کے قدیم راجاؤں نے جو سڑکیں بنوائی تھیں ان کے نشان اب تک باقی ہیں۔ مسلمان حاکموں نے جو راستے ڈالے تھے وہ اب تک استعمال ہو رہے ہیں ہندستان کے مسلمان بادشاہوں میں تعمیری کاموں کے لئے یوں تو فیروز شاہ تغلق نے بڑی نیک نامی حاصل کی مگر سب سے پہلے جس نے دوامی شہرت حاصل کی وہ شیر شاہ سوری تھا۔ اس کے طفیل سے ہندستان کو کم سے کم چار بڑی سڑکیں نصیب ہوئیں اور پنجاب اور راجپوتانہ میں آمدورفت اور نقل و حمل کی سہولت ہوئی شیر شاہ سوری نے ۱۵۵۶ء سے ۱۵۵۷ء تک شمالی ہندستان کے ایک بڑے علاقے پر حکومت کی اور اسی قلیل مدت میں بڑے بڑے راستوں پر سایہ دار درخت لگوائے اور سترہ سو سرائیں تعمیر کروائیں۔

شہنشاہ اکبر کے زمانے میں لاہور سے آگرہ تک نئی سڑک تعمیر ہوئی۔ یہ چار سو میل سے زیادہ لمبی ہو۔ اس زمانے میں مختلف ملکوں کے جو تاج آئے تھے

انھوں نے بھی اس سڑک کی تعریف کی ہو۔ مغل بادشاہوں کے زمانے میں متعدد چھوٹی بڑی ندیوں پر پل تعمیر ہوئے تاکہ برس کے بارہ مہینے بغیر کسی رکاوٹ کے آمد و رفت رہ سکے۔

”عمدہ موسیٰ سڑک“ کو ”ہر موسیٰ سڑک“ بنانے کے لیے منلوں نے بے شمار چھوٹے بڑے پل بنائے جن میں سے کئی منلیہ حکومت کے زوال کے زمانے میں بے احتیاطی کی وجہ سے برباد ہو گئے یا دیدہ و دانستہ اس طرح تباہ کر دیے گئے کہ ان کا اب پتہ تک نہیں چلتا۔ جان بوجھ کر پلوں کو برباد کرنے کی وجہ دشمن کی چڑھائی کو روکنا یا دشمن کی فوج کے لئے دشواری پیدا کرنا تھی۔ اب بھی جنگ میں یہی ہوتا ہو۔ پلوں کا توڑنا مصلحتاً ضروری ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ مگر توڑے ہوئے پلوں کو از سر نو بنانے کی توفیق نا اہل جانشینوں کو کم ہوئی۔ غرض مدت ہوئی ان گنت پلوں کی آخری نشانیاں بھی سیلاب یا بھونچال کی وجہ سے صفحہ ہستی سے غائب ہو گئیں۔ پھر بھی ہمارے بخت اور زمانے کے اتفاق سے منلیہ تعمیر کار ناموں کی جو مثالیں غارت پسندی سے محفوظ رہ گئیں ہیں وہ پنجگی اور خوبصورتی کے لحاظ سے قابل رشک ہیں اسی قسم کی ایک شاندار مثال جو پور کے قریب دریائے گنتی کا پل ہو جسے ۱۷۵۷ء اور ۱۷۷۷ء کے درمیان منم خاں نے بنوایا تھا۔ پائیداری کا یہ حال ہو کہ سیکڑوں برس سے یہ پل وقت اور پانی کا مقابلہ کر رہا ہو۔ متعدد چھوٹے بڑے زلزلے آئے، کئی مرتبہ زوروں سے طغیانی آئی، سارا پل تہ آب ہو گیا، پل کے اوپر دوس دس فٹ اونچا پانی گزرا، ہر مرتبہ خیال ہوا کہ شاید اس مرتبہ پل بھی بے گیا ہو گا مگر ہر مرتبہ پانی کے

لے

Fine Weather Roads (عمدہ موسیٰ سڑکیں) ان سے مراد وہ سڑکیں ہیں جو صرف عمدہ موسم میں

استعمال ہوتی ہیں اور بارش کے زمانے میں ناقابل گزر ہو جاتی ہیں اور بارش کے کئی دنوں بعد تک بہت دشوار گزرا

رہتی ہیں۔ All Weather Roads. (ہر موسیٰ سڑکیں) وہ سڑکیں کہلاتی ہیں جو پختہ اور پس دار ہیں۔

اُترتے ہی پورا پل صبح و سالم نظر آیا۔

فن تعمیر اور حُسنِ کاری کا یہ تہنا نمونہ نہیں ہے۔ ملک کے ہر سمت میں ایسے کئی نمونے ہیں جو نہ صرف پُرانی نسلوں اور حاکموں کی شاندار یادگار ہیں بلکہ سیکڑوں برس سے مفید خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ابو الفضل نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کا کام اس محکمے کے سپرد تھا جو اکبر کے زمانے میں میر برہہ کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ سالہا سال تک اس عہدے پر قاسم خاں فایز رہا جس نے کئی پل بنوائے۔ جہانگیر نے سڑکوں کو بہتر بنانے کی برابر کوشش کی، ہر کوس پر فاصلے کے نشان لگوائے اور تراہوں اور چوراہوں پر نام داری تختیاں لگوائیں، تاکہ مختلف مقاموں کو جانے والے راستے آسانی سے معلوم ہو سکیں۔

سڑکوں کو بنانے کی ضرورت ہر منظم سلطنت کو ہوتی ہے کیونکہ سڑکیں تجارتی اور معاشی نقطہ نظر سے بہت اہم ہیں، انتظامی نقطہ نظر سے اور فوجی اغراض کے لئے عہدہ سڑکوں کا ہونا لازمی ہے۔ انھیں ضرورتوں کی وجہ سے مغلوں نے بھی ہمارے سڑکوں کی تعمیر پر بہت محنت اور روپیہ صرف کیا اور کہا جاتا ہے کہ کلکتہ سے پشاور تک کی گراند ٹرنک روڈ مغلوں کی قائم کردہ ڈھاکہ — دہلی سڑک کی جدید اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ اسی طرح شہنشاہ اوزنگ زیب نے دکن کی مم کو زیادہ آسانی سے سر کرنے کے لئے دہلی اور دکن کے درمیان جو سڑک بنوائی تھی اُس کے حصے اب دہلی، ناگپور اور ناگپور بمبئی کی سڑکوں میں شامل ہیں۔

انگریزوں کے عہد میں سڑکوں کی تعمیر و توسیع کی طرف بہت توجہ ہوئی ابتدا میں یہ لوگ بھی ذرا لاچار تھے مگر بعد میں سڑکوں کی تعمیر و نگہداشت کا باقاعدہ انتظام کر دیا گیا۔ اس کا آغاز لارڈ ولیم بینٹک نے کیا اور لارڈ ڈلہوزی نے اس کو ترقی دی۔ اس وقت سے اب تک زیادہ سڑکیں، بہتر سڑکیں، پختہ سڑکیں اور شاہ سڑکیں

بنتی چلی جا رہی ہیں۔ کچھ عرصے سے بے گروہی سڑکوں کا رواج بڑھ رہا ہے اور کوئی سال ایسا نہیں گزرتا کہ کچی سڑکوں کو پختہ نہ کیا جاتا ہو اور خاص کر تہنروں میں بے گروہی سڑکیں، ڈام یا سینٹ کی نہ بنوائی جاتی ہوں۔

ایک چھوٹی سی کتاب میں سڑکوں کی عہد بہد کی تاریخی سرگزشت بیان کرنا باعث طوالت اور ناظرین کے لئے غیر دلچسپ بھی ہوگا لہذا گزشتہ صدی میں ہماری سڑکوں کی کیفیت اور حالت اختصار سے بیان کی جاتی ہے۔

لاہور و لیم بٹنک ۱۸۲۹ء سے ۱۸۳۵ء تک گورنر جنرل رہا جو اس کا شمار ہندستان کے ان معدودے چند انگریز حاکموں میں ہوتا ہے جنہوں نے بڑی دانشمندی سے ہندستان میں حکومت کی ہے۔ اس نے کئی خوشگوار اور مفید اصلاحیں کیں جن میں اخراجات کی تخفیف، مال گزاری کا انتظام، اینون کی تجارت پر روک تھام انگریزی کا رواج اور سب سے بڑھ کر سستی کی ممانعت قابل لحاظ ہیں ہندوستانیوں کے حق میں بعض اصلاحیں مفید نہ تھیں مگر ان کی اہمیت سے انکار نہیں۔ اسی گورنر جنرل کو خیال ہوا کہ بنگال کو شمالی ہندستان کے تمام صوبوں سے ملحق کرنے کے لئے دہلی سے کلکتہ تک سڑک تعمیر کرنی چاہیے چنانچہ اسی کے زمانے میں یہ سڑک ازسرنو تعمیر ہوئی اور مغلوں کی تعمیر کردہ سڑک کے جو جو حصے زلزلوں اور سیلابوں کی وجہ سے غائب ہو گئے تھے دوبارہ تعمیر کرائے گئے۔ اور اس سڑک کا نام گرانڈ ٹریک روڈ رکھا گیا۔ جو اب تک مشہور ہے۔ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۷ء تک لاہور ڈیپوٹی

ہندستان کا گورنر جنرل تھا۔ یہ بڑا تیز مزاج اور جان دار حاکم تھا، اس نے بھی ہندستان میں بڑی اہم اصلاحیں کیں، اور ہندستان میں انگریزی راج کو بڑھانے اور مستحکم بنانے میں بہت کامیاب رہا۔ تعمیرات اور ذرائع آمد و رفت کے نقطہ نظر سے اس کا عہد حکومت بہت اہم ہے۔ اس ضمن میں اس کا سب سے پہلا کارنامہ

محکمہ ڈاک کی اصلاح اور ٹکٹوں کا رواج ہر ہندستان کے اندر ہر جگہ لفافے بھینچنے کے لیے آدھ آنے کا ٹکٹ اور کارڈ بھینچنے کے لیے پاؤ آنے کا ٹکٹ مقرر کیا گیا۔ ٹکٹوں کی یکساں قیمت کی وجہ سے نہ صرف کاروباری اداروں اور عوام کو سہولت ہوئی بلکہ محکمہ ڈاک کو بھی بے حد انتظامی سہولت ہوئی۔ ۱۸۵۳ء میں سب سے پہلی ریل گاڑی چلی۔ ۱۸۵۷ء میں مرکزی محکمہ تعمیرات (سنٹرل پی۔ ڈبلیو۔ ڈی) اور ہر صوبے میں صوبہ داری محکمہ تعمیرات قائم ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں آگرے سے کلکتہ تک سب سے پہلا تار بھیجا گیا۔ تعمیرات عامہ کے ان مختلف ذریعوں کو ترقی دینے کے علاوہ ڈلباؤزی نے سڑکوں کی تعمیر و مرمت پر بھی توجہ کی۔

ڈلباؤزی کے زمانے تک ریل اور سڑک کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا مگر جیسے جیسے ریلوں پر صرف کردہ ریل کی مقدار بڑھتی گئی اور ریلوں کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا اس کا پرتو سڑکوں کی تعمیر پر پڑتا گیا۔ چنانچہ گزشتہ ستر اسی سال میں ریل اور سڑک کا مسئلہ ایک مخلوط مسئلہ بن گیا ہے۔ ریلوں کی خاطر ان سڑکوں کو جو ریلوں کے متوازی یعنی برابر برابر جانے والی تھیں نظر انداز کیا جانے لگا تاکہ سڑکوں کی حالت خراب ہونے سے کاروباری ادارے اور عوام سہولت اور کفایت کی خاطر ریلوں کی مرہمتی کریں جس کی وجہ سے ریلوں کو اور ریلوں میں رپیہ لگانے والے انگریز سرمایہ داروں کو اور ریلیں چلانے والی انگریزی کمپنیوں کو فائدہ پہنچے۔ یہی وجہ تھی کہ انیسویں صدی کے آخری نصف میں ان سڑکوں کو بھی جو شاہراہیں تھیں (مثلاً گرانڈ ٹرنک روڈ!) نظر انداز کیا جانے لگا اور دیدہ و دانستہ بے مرمت رکھا تاکہ ریلوں کو زیادہ مسافر اور زیادہ مال ملے! جس قدر ریلوں کے برابر برابر جانے والی یعنی متوازی سڑکوں کے برے دن آئے اسی قدر ریلوں کو فائدہ پہنچانے والی سڑکوں کو اچھے دن نصیب ہوئے چنانچہ تمام اہم منڈیوں اور شہروں

سے قریب ترین ریلوے اسٹیشن تک عمدہ سڑک ڈالنے کے معنی یہ تھے کہ ریلوں کے لیے ایک پرورشنی راستہ (FEEDING LINE) بنایا جا رہا ہو جس کے توسط سے ریلوں کو مسافر زیادہ تعداد میں اور مال زیادہ مقدار میں وصول ہوگا اور ضمناً حتم اشیا کو انگلستان بھیجنے میں اور غیر ملکی مصنوعات کو اندرون ملک تک پہنچانے میں سہولت ہوگی۔ غرض برطانوی ملوکیت کے ہم آہنگ اصول قرار کیے جاتے تھے اور انھیں کے مطابق ریلوں کے افسر اور سڑکوں کے عہدے دار عمل کرتے تھے گزشتہ پچاسی سالہ تاریخ شاہد ہو کہ ہندستان کی حکمت عملی اور ہر محکمے میں سب سے زیادہ لحاظ انگلستان کا رکھا جاتا تھا اور اسی کی خاطر کم سے کم انیسویں صدی کے آخری نصف میں ریلوں کی متوازی سڑکوں کی شان گھٹادی گئی اور ریل کی پٹریوں سے زاویہ قائمہ بناتی ہوئی جانے والی سڑکوں کی شان بڑھادی گئی اور انیسویں صدی کے ختم تک تمام تعمیراتی محکموں کی یہی روش رہی یعنی ایسی سڑکیں بناؤ اور ان سڑکوں کو سنبھالو جن سے ریلوں کی پرورش ہو، یا ان سڑکوں کو بھول جاؤ یا ان سے سویتیلی ماں کا سلسلوک کر دو جس سے ریلوں کو نقصان کا امکان ہو۔

بہر حال ان متضاد اصولوں کے تحت سڑکوں کی توسیع و ترقی ہوئی اور مجبوراً یا مصلحتاً صرف بڑی بڑی شاہراہوں کو سنبھالے رکھا گیا تا وقتیکہ اس صدی کے آغاز میں موٹروں کی ایجاد ہوئی جس کا رواج سال بسال بڑھتا گیا جنگ کے بعد موٹروں کی تجارت کو بہت فروغ ہوا، بسوں کا رواج بھی بڑھ گیا۔ سہولت اور کفایت کے علاوہ کئی موقعوں پر وقت کی بچت بھی ہونے لگی، بسوں کو چلانے کے لیے ابتدائی خرچے کی زیادہ ضرورت نہ تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ موٹروں میں نقل و حرکت کرنے سے عہدہ داروں، امیروں، با اقتدار ہستیوں اور حاکموں کو فائدہ تھا اور موٹروں اور بسوں کی درآمد سے بہر حال انگریز ہی زیادہ تر فائدہ اٹھاتے تھے۔

جب تک انگریزوں کو فائدہ پہنچانے والی ہندوستانی ریلوں کا مقابلہ سڑکوں سے تھا ریلوں کی ترقی اور کامرانیوں کی مسلسل داستان تھی۔ مگر اب برابری کا مقابلہ تھا بلکہ انفرادی سہولت اور کفایت کے اعتبار سے موٹروں اور بسوں کا پہلہ بھلا رمی تھا البتہ ریلوں میں لگائی ہوئی ۸ آٹھ ارب کی پونجی کو بھلانا بھی دشوار تھا غرض موٹروں کی ایجاد اور اس کے رواج سے ریلوں اور موٹروں میں جو مسابقت پیدا ہوئی وہ ایک ایسا مسئلہ ہو گیا ہے جو خاطر خواہ طور پر کہیں حل نہیں ہوا۔ پھر بھی موٹروں اور بسوں کی وجہ سے سڑکوں کے بڑے دن ختم ہو گئے اور ان پر بھی از سر نو عنایت ہونے لگی، بلکہ ہر بنیاں اور عنایتیں بڑھنے لگیں سب سے پہلے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کو ملانے والے راستے درست کیے گئے اور ہمیشہ درست حالت میں رکھے جانے لگے کیونکہ رفتہ رفتہ موٹروں کی آمد و رفت دن رات ہونے لگی۔ چھوٹے بڑے عہدہ داروں کا سڑکوں سے گزرنا بڑھتا گیا۔ بڑے بڑے تعمیراتی افسر بھی آئے دن انھیں سڑکوں کے ذریعے آنے جانے لگے جو چند سال پہلے اپنے ریل کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے شہارت آمیز نظر سے سڑکوں کو اور ان پر چلنے والے کھاچروں اور چھپکڑوں کو دیکھتے تھے اور صرف مجبوری کی صورت میں سڑکوں پر سفر کرتے تھے۔

موٹروں اور بسوں کے رواج نے صورت حال کو بالکل بدل دیا اور اب بڑے بڑے افسروں کے لیے بھی مفید مطلب تھا کہ دورے کریں تو موٹروں کے ذریعے قریب کے مقاموں کی سیر کے لیے جائیں تو موٹروں کے ذریعے؛ لہذا سڑکوں کی درستی شروع ہوئی، نئی نئی سڑکیں ڈالی گئیں، اصلاح کے لیے بے گری سڑکوں کی پکار شروع ہو گئی ہے، بعض مقاموں پر اس کا آغاز بھی ہو چکا ہے، امریکہ اور جرمنی کی ہم دار، کشادہ سمیٹی سڑکیں تمام ارمان بھرے موٹر نشینوں کا

خوش آئند خواب ہیں اور وہ دن دور نہیں جب کہ ہندستان میں ہزار ہا میل لمبی سینیٹی سڑکیں ہوں گی اور کلکتہ سے پشاور تک، دہلی سے بمبئی تک، بمبئی سے مدراس تک اور ان کے علاوہ جہاں کہیں زور دار حاکم ہو یا دور اندیش و با اثر افسر نصیب ہو سینٹ کی عمدہ سڑکیں تعمیر ہوں گی اور سینیٹی سڑکوں کا بھی ایک جال سارے ہندستان پر کچھ جائے گا !

موجودہ صورتِ حال یہ ہو کہ تمام بڑے بڑے شہروں اور اہم منڈیوں کے درمیان پتی سڑکیں بن گئی ہیں، نقشہ دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے ہندستان پر سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ ان پختہ سڑکوں کی مجموعی لمبائی ایک لاکھ میل سے کچھ ہی زیادہ ہے (صرف برطانوی علاقوں میں پتی سڑکوں کی لمبائی ۱۹۳۶ء میں ۸۲,۰۰۰ میل سے کچھ زیادہ تھی مگر بہت سی دیسی ریاستوں میں بھی عمدہ عمدہ پتی سڑکیں ہیں) ہندستان جیسے بڑے ملک کے لیے جو درحقیقت ایک نیم براعظم ہے، ایک لاکھ میل کی پتی سڑکیں بہت کم ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہزاروں گاؤں یا قصبوں کے درمیان صرف کچھ سڑکیں یا راستے ہیں جن سے بڑے بھلے کام کھلتا ہے۔ مرکزی حکومت اور صوبے داری حکومتوں کو اس امر کا احساس ہونے لگا کہ سڑکوں کی تعمیر اور ان کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں جو کام ہوتے ہیں ان سب میں اشتراک عمل ہو اور سارے ملک کے لیے ایک ہی اصول مرتب کیا جائے۔ ان امور کی تحقیق کے لیے حکومت ہند نے ۱۹۲۷ء میں ”روڈ ڈیولپمنٹ کمیٹی“ (ROAD DEVELOPMENT COMMITTEE) قائم کی۔ اس کمیٹی نے ایک اہم سفارش یہ کی کہ سڑکوں کی ترقی مرکزی مالیات کے ذریعے ہو کمیٹی نے واضح کیا کہ سڑکوں کی ترقی کے لیے جو مصارف درکار ہوتے ہیں انہیں صوبے اور مقامی ادارے برداشت نہیں کر سکتے۔ نیز جب سڑکوں کے ذریعے

مرکزی حکومت کو آمدنی حاصل ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے سے چھپے ہٹے کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ موٹر محصول (اس میں موٹر اسپرٹ پر محصول VEHICLE TAXATION اور کرائے پر چلنے والی گاڑیوں کی لائسنس فیس شامل ہیں) سڑکوں کی ترقی کے لیے استعمال ہو، یہ بھی سفارش کی گئی کہ سڑکوں کی از سر نو تقسیم ہوتا کہ مقامی اداروں کا بار کم ہو سکے۔

۱۹۲۹ء کے قانون مالیات ہند کی رو سے موٹر اسپرٹ پر محصول ۴۴ آنے سے ۶۴ آنے فی گیلن کر دیا گیا، اور اس طرح جو زیادہ آمدنی حاصل ہوئی وہ سڑکوں کی ترقی کے لیے مختص کر دی گئی اور ایک (ROAD DEVELOPMENT ACCOUNT) (سڑکوں کی توسیع کا حساب) کی بنا ڈالی گئی۔ اس فنڈ میں سے ۵ فی صد تو حکومت ہند اپنے لیے محفوظ رکھتی ہے تاکہ وہ اپنی ضرورت کے تحت صوبے واری یا بین صوبائی سڑکوں کی تعمیر و توسیع کے نظام عمل پر زیادہ آسانی سے اثر ڈال سکے مختلف صوبوں میں جس قدر پٹرول صرف ہوتا ہے اسی مناسبت سے ان میں بقیہ رقم تقسیم کر دی جاتی ہے۔ جملہ امور کی نگرانی کے لیے اور سڑکوں کے بارے میں مزید مشورہ دینے کے لیے روڈ کانفرنس بھی منعقد ہوا کرتی ہے جس میں حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں۔

کچی سڑکوں کی مجموعی لمبائی برطانوی علاقوں میں دو لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ ایسی ریاستوں میں کچی سڑکیں ایک لاکھ میل لمبی ہوں گی بغرض سارے ہندستان میں پکی اور کچی کل سڑکوں کی مجموعی طوالت چار لاکھ میل ہے۔ اس کی اصلیت کا اندازہ ہم آسانی سے اس وقت کر سکیں گے جب ہم اپنے ملک کا مقابلہ بعض ترقی یافتہ ملکوں کے رقبے اور سڑکوں کی لمبائی سے کریں۔

معاشی اعتبار سے دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک امریکہ کی متحدہ ریاستیں

ہیں۔ متحدہ امریکی ریاستوں کا رقبہ اگرچہ ہندستان کے رقبے سے دو گنا ہو مگر وہاں کی سڑکوں کی مجموعی لمبائی سولہ میں ... ۳۰۰۰۰۰ (تیس لاکھ) تھی۔ اسی اعتبار سے ہمارے ملک میں پندرہ لاکھ میل لمبی سڑکیں ہونی چاہئیں تھیں، مگر ہمارے یہاں صرف ۳ لاکھ میل ہی سڑکیں ہیں، جن میں سے تین لاکھ کچھ ہیں! اسی تقابل سے ہم امریکیوں کی عظمت و دولت اور اپنی غربت و نکبت کا اندازہ کر سکتے ہیں! برطانیہ عظمیٰ یعنی انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور آئرستان کا مجموعی رقبہ ہندستان کے رقبے سے پندرہ گنا کم ہو مگر وہاں بھی کئی سڑکوں کی لمبائی دو لاکھ ہو! اگر انگلستان کے رقبے اور سڑکوں کی باہمی نسبت کے مطابق ہمارے ملک میں بھی سڑکیں ہوتیں تو ہماری سڑکوں کی لمبائی تین لاکھ ہوتی!! یہ تقابلی اعداد صرف سڑکوں کی طوالت کو ظاہر کرتے ہیں، سڑکوں کی عمدگی اور کشادگی کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو ان ملکوں کی سیر کر چکے ہیں یا جن میں اتنی تخیل کی قوت ہو کہ وہ اخباروں میں گا ہے ماہے شایع ہونے والی یا فلموں میں دکھائی دینے والی تصویروں سے قیاس کر سکیں کہ وہاں کی سڑکیں کتنی نفیس ہیں! جرمنی اور اطالیہ نے جو عمدہ عمدہ ”موٹر راہیں“ بنائی ہیں وہ نہ صرف بہت کشادہ ہیں اور سیمینٹ کی ہونے کی وجہ سے گرد و غبار سے محفوظ ہیں بلکہ مختلف نشانیوں سے آراستہ ہیں، موٹر چلانے والے کو کافی فاصلے ہی سے جا بجا لگی ہوئی بین الاقوامی علامتی تختیاں نظر آتی ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہو کہ آئندہ کس قسم کا راستہ آنے والا ہو، موٹر کو ظاہر کرنے، اتار چڑھاؤ کو ظاہر کرنے کا نو یا قصبے کی سمت کو ظاہر کرنے، فاصلے کو ظاہر کرنے کی علامتیں ہر موزوں مقام پر لگی ہوئی ہیں، بہر حال ہم افادیت، سہولت اور آرام کا لحاظ کریں تو امریکی یا یورپی سڑکیں ہماری سڑکوں سے سو گنی بہتر ہیں!! یہ نسبت مبالغہ آمیز نہیں اور نہ غیر ذمے دارانہ طور پر مقرر کردی گئی ہو! ریلیوں اور سڑکوں کے

متعلق میرا جو کچھ بھی تجربہ ہو اور سڑکوں اور ریلوں کے متعلق میری جو کچھ بھی واقفیت ہو اس کے پیش نظر تمام نکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے ایک اور نسخہ کی نسبت مقرر کی ہو! یہ ناقابل انکار امر ہو کہ امریکہ اور جرمنی، فرانس اور انگلستان کی طرح ہنایت کشادہ، سایہ دار، بے گرد کی سیمنٹ یا ڈامر کی سڑکیں ہندستان کے صرف بڑے بڑے شہروں اور چھاونیوں میں پائی جاتی ہیں اور جب کبھی ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ہوتا ہو تو وہی کچی کچی پٹی سڑکوں پر چلنا پڑتا ہو جن کی امتیازی خصوصیت گرمیوں میں دھول اور بارش میں کیچڑ ہو! ہمارے ملک کی سڑکوں کے نقشے پر ایک نظر ڈال کر دیکھیے، بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہو کہ سارے ملک میں راستوں کا گھنا جال بچھا ہوا ہو مگر ذرا غور سے دیکھیے تو جا بجا رکاوٹوں کا نشان یعنی چلیپا نظر آئے گا، اس کا مطلب یہ ہو کہ اس مقام پر پل نہیں ہو، ممکن ہو کہ ندی کو عبور کرنے میں دشواری ہو یا اس کو پار کرنا ہی ناممکن ہو مثلاً شاہجہاں پور سے فتح گڑھ آنے جانے میں گنگا اور رام گنگا دونوں کو پار کرنا پڑتا ہو، اسی طرح محبوب نگر سے کرنول آنے جانے میں کرشنا اور تنکا بھدرا ندیاں ملتی ہیں، ان راستوں پر پل نہ ہونے کی وجہ سے آج بھی نہ صرف وقت ہوتی ہو بلکہ اکثر عبور کرنے میں اتنی تکلیف ہوتی ہو اور اتنا وقت صرف ہوتا ہو کہ لوگ ریل کے ذریعے سفر کرنا پسند کرتے ہیں! ان مقاموں پر ریلوں کے تعمیر نہ ہونے کی وجہ، بعض صورتوں میں اہم ترین وجہ یہ بھی ہو کہ ریلوں کی آمدنی کم نہ ہونے پائے اور بے پل کی سڑکوں سے پریشان ہو کر مجبوراً ریل کا سفر کرنے والوں کی معقول تعداد ہمیشہ رہے!! ہماری سڑکوں پر اثر انداز ہونے والی ایک اندرونی وجہ یہ بھی ہو!! سیاست اور معیشت، حاکمیت اور اطاعت کا پرتو ہماری سڑکوں پر بھی پڑتا ہو۔

۱۸ گز مشہدہ دس سال میں ہندستان کے اکثر بڑے شہروں کے درمیان بھی سیکڑوں میل لمبی سڑکیں بن گئی ہیں۔ (مدیر انجمن ترقی اُردو)۔

دوسرا باب

ہماری آب راہیں

ہندستان میں پانی کے راستے وہ ندیاں ہیں جو قدرتی طور پر جہاز رانی کے لیے موزوں ہیں یا ساحلی آمد و رفت یا نقل و حمل جو قدیم ترین زمانے سے چھوٹی بڑی کشتیوں کے ذریعے ہوتی چلی آئی ہو۔ ہمارے پانی کے راستے کم سے کم موجودہ زمانے میں غیر اہم ہیں مگر نہ صرف کتابی تسلسل قائم رکھنے کے لیے بلکہ گزشتہ زمانوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے اور آئندہ عبرت دلانے کے لیے یا بھٹوڑا بہت جو بیش عمل پیدا کرنے کے لیے ہمیں اپنے سمندری راستوں کی سرگزشت معلوم کر لینی چاہیے۔

سندن کے بالکل ابتدائی دور میں آنے جانے اور مال اسباب لانے لے جانے کے لیے انسان کے پاس اپنی ذات کے سوا کچھ نہ تھا جس طرح وہ پیدل چل کر اور اپنے کندھوں پر بوجھ اٹھا کر راستہ طو کرتا تھا اسی طرح پانی کے راستے کو طو کرنے کے لیے اُسے تیرنا پڑتا تھا اور ظاہر ہو کہ تیرنے کا خیال بھی اُسے جانوروں کو تیرتا ہوا دیکھ کر پیدا ہوا ہو گا۔ یہ عجیب بات ہو کہ دنیا کے اکثر جانور ہاتھی اور ہیل، گینڈا اور شیر، کتا اور بلی وغیرہ تیرنا جانتے ہیں اور انھیں فطری طور پر تیرنا آتا ہے برعکس اس کے انسان کو تیرنا صرف مصنوعی طور پر سیکھنے سے آسکتا ہے، یعنی سیکھنے میں بھی خاص طور پر کوشش کرنی پڑتی ہو، محض سننے بولنے

سے جس طرح بچے زبان سیکھتے ہیں تیرنا تھوڑی آتا ہو؟ غرض پانی پر سے گزرنے کے لیے انسان نے تیرنا سیکھا اور پیٹھ پر لا کر مال اسباب لے جانا شروع کیا۔ تیرنا بحیثیت تفریح اور کسرت کے بڑا دلچسپ مشغلہ ہو۔ مگر راستوں کو طو کرنے کے لیے بہت تکلیف دہ ہے لہذا انسان نے اپنی ہتھیلی اور چالاک سے کام لے کر لکڑی کے تختوں کو پانی میں ڈال کر ان پر سواری شروع کی تاکہ پانی کا راستہ طو کرنے میں آسانی ہو، بعد میں ان لکڑی کے تختوں کو بیچ میں سے کھوکھلا کر کشتی نما بنانا شروع کیا اور اس میں سوار ہو کر پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہنا شروع کیا، رفتہ رفتہ کشتی کی ساخت بہتر ہونے لگی اور اس میں ڈانڈے بھی لگ گئے اور کھینا ممکن ہوا، جیسے جیسے صدیاں گزرتی گئیں اور صنعت و حرفت میں ترقی ہوتی گئی، کشتیوں کی ساخت اور بھی اچھی ہوتی گئی اور بڑی بڑی کشتیاں بننے لگیں، ندیوں پر ناؤ چلنے لگی، ساحل کے قریب قریب سمندری سفر شروع ہوا۔ بعض نڈر اور کھوجی ملاحوں نے نہ معلوم کہاں کہاں کے سمندری راستے اختیار کیے، سیکڑوں نے اپنی جانیں قربان کیں تو بعض خوش قسمت افراد کو اپنی جرات کا صلہ ملا اور انھوں نے قرب و جوار کے جزیرے دریافت کیے اور یہی خوشی صبح سلامت واپس آئے۔ ان کی کامیابی سے دوسروں کی ہمتیں بڑھیں، کشتی سازی کی صنعت کو فائدہ ہوا، اتنی بڑی بڑی کشتیاں بننے لگیں کہ اس کے لیے نئے الفاظ کی ضرورت ہوئی۔ ان جہازوں پر بڑے بڑے مضبوط پردے لگائے گئے، ان بادبانی جہازوں کی وجہ سے کھینے کی تکلیف اور مصیبت کم ہو گئی، چین والوں نے قطب نما دریافت کیا ہتھیلیاں ملاحوں نے تاروں کو دیکھ کر راستہ معلوم کرنا شروع کیا اور اس طرح حقیقی معنی میں سمندری سفر اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک سمندر کے ذریعے آمد و رفت ہونے لگی۔ تاروں کو دیکھ کر سمت اور رخ کیونکر معلوم کیا جاسکتا ہے اور مطلوبہ سمت پر

پہنچنے کے لیے ٹھیک راستہ کیسے نکالا جاسکتا ہو اس کو سمجھنا ناواقفوں کے لیے ناممکن ہو البتہ آپ اور ہم نوجوان اور ادھیڑ، بچے اور بوڑھے، مبتدی اور عالم سب اس لاجواب اور بے قافیہ نظم سے محفوظ ہو سکتے ہیں جو ہماری زبان کے بلند پایہ شاعر اشعٰیلؒ نے تاروں کو مخاطب کر کے لکھی ہو، اس کا آخری بند ہو :-

وہ جہاز جن کے آگے ہیں وسیع بحر اعظم
انھیں ہولناک موجوں سے مقابلہ ہو کر نا
کوئی ہو چلا وطن سے کوئی آ رہا ہو واپس
انھیں کچھ خبر نہیں ہو کہ کدھر ہو ان کی منزل
نہ تو مرحلہ نہ چوکی نہ سراغ راہ کا ہو
نہ کوئی دلیل و رہبر مگر اے فلک کے تارو
تھیں ان کے رہنا ہو

انھیں ستاروں کی مدد سے اپنا راستہ دریافت کرتے ہوئے اور ہوا کے زور سے فائدہ اٹھانے والے بادبانی جہازوں میں ہمارے ملک کے قدیم باشندوں نے قرب و جوار کے تمام سمندروں کو چھان ڈالا، کبھی کبھی دور دراز ممالک کی سیر کی، براہ و جاوا، لنکا اور افریقہ سے مستقل طور پر تجارتی تعلقات قائم کیے، باہر کے لوگ یہاں آئے اور یہاں آکر ایسے بسے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے، عالم آئے، تاجر آئے، صنّاع آئے، کاریگر آئے، فاتح آئے، سیاح آئے، چینی آئے، ایرانی آئے، حبشی آئے اور عرب آئے، ہندستان بھانت بھانت کی قوموں کا وطن اور مسکن ہو گیا !

اگرچہ عام کتابوں میں ہماری قدیم جہاز رانی اور جہاز سازی کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہو مگر بعض محققوں کا خیال ہو کہ ہندستان نے قدیم زمانے میں جہاز سازی

اور جہاز رانی میں کمال پیدا کر لیا تھا۔ جو لوگ مغلیہ حکومت کے مداح ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ مغلوں نے فن جہاز رانی کو بہت کچھ ترقی دی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اجنٹا کے غاروں میں بھی ایسے جہازوں کی تصویریں ملتی ہیں جن کے متعلق قیاس کیا جاسکتا ہو کہ وہ ہندستانی تھے۔ مغلوں نے سیر و تفریح اور تجارت اور فوج کی سہولت کی خاطر الہ آباد پر تقریباً تین ہزار کا بیڑہ رکھا تھا، آسام اور بنگال کی ندیوں میں بھی یقیناً ہندستانی جہاز چلتے تھے۔ اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے ہماری جہاز سازی کی صنعت اور جہاز رانی کی قابلیت غنیمت تھی مگر پھر بھی یہ تلخ حقیقت مٹائے نہیں مٹ سکتی کہ عین اُسی زمانے میں جو مغلیہ سلطنت کا زریں دور تصور کیا جاتا ہو بدلیسیوں نے کسی ہندستانی بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا تھا گوہیں پرمنگالی، مدراس اور سورت میں انگریز، پانڈیچری میں فرانسیسی مستقل طور پر مغلوں کے زمانے ہی میں جم گئے تھے اور کئی مرتبہ دریائی ڈاکوؤں اور سمندری قزاقوں نے مغلیہ فوج اور ہندستانی تجارت کو نقصان پہنچایا تھا۔ میرا خیال ہو کہ مغلوں کے زوال اور ہندستانیوں کی حکومت کے خاتمے کا ایک اہم سبب ہماری بحری کمزوری تھی چنانچہ دو ایک مرتبہ (مثلاً اورنگ زیب کے عہد میں) ان بندرگاہوں سے بدلیسیوں کو نکالا گیا تو یہ دارو گیر سے پہلے ہی جہازوں میں قیمتی سامان لے کر سمندر میں دُور جا بکھے اور ان کا پیچھا کرنے کے لیے ہندستانیوں کے پاس کافی بیڑا نہ تھا! میں یہ نہیں کہتا کہ ہندستان کا فن جہاز سازی اور جہاز رانی ناقابل لحاظ تھا لیکن ہمارے جہازوں کی تعداد سراسر ناکافی تھی، ہمارے تجارتی اور فوجی بیڑے کو ترقی دینے کی مسلسل اور باضابطہ کوشش نہیں کی گئی تھی زمانے کی رفتار کے ساتھ جہاز سازی کی صنعت نے بھی ترقی نہیں کی تھی، کافی تعداد میں اولوالعزم، جاں باز اور جبری سیاح ہندستان نے پیدا نہیں کیے تھے یا کیے

بھی تھے تو یہ ہم امداد اور سرکاری سرپرستی سے ان کی ہمت افزائی نہیں کی گئی تھی۔ اسی کا نتیجہ ہوا کہ ہم نے غیر ملکوں کو جانے کا سمندری راستہ دریافت نہیں کیا بلکہ غیروں نے افریقہ کے جنوبی ساحل سے گھوم کر ہندستان آنے کا راستہ معلوم کیا اور اچانک کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے کے چھ سال بعد ہی ۱۴۹۲ء میں واسکو ڈی گاما کا لیکٹ پہنچا اور یورپ سے سمندر کے ذریعے ہندستان آنے کا راستہ دریافت ہوا اس میں شک نہیں کہ اس بحری راستے کے انکشاف سے آمد و رفت اور نقل و حمل بڑھ گئی، توطن اور تجارت کو فروغ ہوا، مگر پردیسیوں کا عمل دخل بھی بڑھ گیا ہندستانی جہاز سازی اور جہاز رانی کو شروع میں کم بعد میں بہت زیادہ نقصان ہوا۔ اور ان نو واردوں میں ایسے بھی بہت تھے جنہوں نے سمندری قزاقی کو علامیہ بطور پیشے کے اختیار کیا تھا! جیسے جیسے ہندستان میں بیرونیوں کا تسلط بڑھتا گیا جہاز سازی کی صنعت پست سے پست ہوتی گئی اور جب سے ہندستان میں ریلیں بننے لگیں (یعنی ۱۸۵۳ء کے بعد سے) ان کشتیوں اور چھوٹے چھوٹے جہازوں کو بھی ہر طرح نقصان پہنچا یا گیا جو گنگا، جمنا، برہمپور اور انڈس جیسی ندیوں پر چلتے تھے۔

ہمارے حاکموں اور ان کے پیروکاروں کی غرض یہ تھی کہ ہر طرح ریلوں کو تقویت پہنچائی جائے اور مال گاڑیوں کی آمدنی بڑھانے کے لیے مال کشتیوں پر گونا گوں دشواریاں عاید کی جائیں تاکہ ٹیکسوں کے بار سے، بے جا مداخلت سے، غیر معمولی اجازتی تاخیر سے، سرکاری بے التفاتی، سرد مہری بلکہ تحقیر سے تنگ آکر ملاح و ناخدا، تاجر و صنعت، مسافر و سیاح سب کے سب اس ذریعہ آمد و رفت کو چھوڑ بیٹھیں۔ چنانچہ یہی ہوا سرکاری ہتھ کھنڈوں سے مجبور ہو کر ہماری معاشی زندگی، سیاسی آزادی اور فنی کمال کا یہ مرتبہ کم اہم ہوا، غیر اہم ہوا،

معدوم ہوا! چنانچہ آج ہمارے پاس ایک بھی جہاز نہیں، اس ذریعہ آمد و رفت میں ہمارا برائے نام ہی عمل دخل ہو چند چھوٹے موٹے بادبانی جہاز ہیں، چند ساحلی آمد و رفت کے لیے موزوں خرید کردہ اسٹیمر ہیں، کشتیاں ہیں، ڈول ہیں، ناوین ہیں! یہ ہو ہماری سمندری کاینات! یہ ہو ہماری آب راہوں کی موجودہ درگت! جس کا حسرت ناک اندازہ ان اعداد سے حاصل کیا جاسکتا ہو: ہر سال ہندستان کی مختلف بندرگاہوں میں آنے والے جہازوں کا مجموعی وزن ایک کروڑ ٹن سے کچھ کم تقریباً نوے یا پچانوے لاکھ ہوتا ہو اور ان نوے پچانوے لاکھ ٹنوں میں آپ جانتے ہیں ہمارا کیا حصہ ہو؟ نصف لاکھ! ان اعداد کی اہمیت محسوس کرنے کے لیے یہ سمجھیے کہ آپ کسی کے ساتھ مل کر تجارت کریں اور آپ دونوں کو تقریباً ۱۰۰ رُپے کا منافع ہو جس میں سے ساڑھے ننانوے رُپے وہ خود رکھ لے اور آپ کے ہاتھ میں اٹھنی پکڑا کر چلتا کرے تو آپ کا دل کیا کہے گا؟ جو لوگ ہندستان کی معاشی اور سیاسی، سماجی اور تعلیمی، فنی اور کاروباری حالت کا مطالعہ کرتے ہیں اُن کا دل بھی یہی کہتا ہو کہ جب ہمارے ہی ملک میں، ہماری یہ بے بسی اور عدم اہمیت ہو تو بین الاقوامی تجارت و جہاز رانی میں ہندستان کی شرکت کی توقع کرنا ہی سراسر نادانی ہو!

ہندستان میں پانی کے
راستوں کی موجودہ حالت

اس میں شک نہیں کہ ہندستان کی
نذیاں اور ساحل جہاز رانی کے لیے
قدرتی طور پر موزوں نہیں، شمالی امریکہ
میں ایک جھیل سے دوسری جھیل تک اور وہاں سے سمندر تک جانے کے لیے

بھر پور ندیاں سدا سے بہتی چلی آئی ہیں اور ان دونوں ملک و قوم کے لیے شاہراہ بنی ہوئی ہیں۔ ان ندیوں پر بڑے سے بڑے جہاز جاسکتے ہیں اسی طرح جنوبی امریکہ میں جو اے زن نامی ندی ہو وہ جہاز رانی کے لیے اس قدر موزوں ہو کہ یورپ سے امریکہ تک جانے والے جہاز اس ندی میں سے ہوتے ہوئے ایک ہزار میل اندرون ملک تک جاسکتے ہیں۔ اگر ہندستان کی ندیاں بھی اسی طرح موزوں ہوتیں تو بین الاقوامی تجارت اور سیاحت کے جہاز انڈس اور رادی سے ہوتے ہوئے لاہور تک، گنگا اور گومتی سے ہوتے ہوئے لکھنؤ تک کرشنا سے موسیٰ ندی سے ہوتے ہوئے حیدر آباد تک آتے، اور یہیں سمندر پار جانا ہوتا تو ہم دہلی یا آگرہ، اٹاوا یا پٹنہ ہی سے جہاز پر سوار ہو کر چلے جاتے! غرض قدرتی موزونیت کے لحاظ سے ہمارا ملک جہاز رانی کے لیے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہے۔ شمالی ہندستان کی ندیاں پھر بھی بہتر ہیں، انڈس، گنگا اور برہم پوتر سال کے بیشتر حصے میں معمولی کشتیوں اور بالکل چھوٹے جہازوں کے لیے موزوں ہیں یا کسی قدر کوشش سے موزوں بنائی گئی ہیں۔ چنانچہ انڈس ندی پر ڈیرا اسماعیل خاں نامی شہر تک (جو آٹھ سو میل اندرون ملک ہے) گنگا پر کانپور تک اور گھاگرا سے ہوتے ہوئے فیض آباد تک جہاز رانی ہوتی ہو، اسی طرح برہم پوتر بھی معمولی کشتیوں اور بالکل چھوٹے جہازوں کی نقل و حرکت کے لیے موزوں ہے۔ شمالی متذکرہ ندیوں کے علاوہ وسط ہند کی ندیاں (ہماندی، زبدا اور تپتی) خاص کر جنوب کی تمام ندیاں (گوداوری، کرشنا، کاوری) جہاز رانی کے لیے بالکل ناموزوں ہیں وہ دراصل بربستی ندیاں ہیں جو بارش میں زوروں پر بہتی ہیں موسلا دھار بارش ہو تو سیلابی رفتار اختیار کرتی ہیں، ورنہ بارش نہ ہو یا کم ہو تو موسم کی بارش میں بھی اور خاص جاڑوں اور گرمی میں بالکل دھیمی رفتار سے بہنے والے نالوں

کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور میلوں تک بالکل سوکھ جاتی ہیں اور قرب و جوار کے رہنے والے پانی حاصل کرنے کے لیے ندی کی تہ میں جا بجا کھڈے کھودتے ہیں پانی کی کمی کے علاوہ وسطی، دکنی اور جنوبی ندیوں کی تہ بھی جہاز رانی کے لیے قدرتی اعتبار سے موزوں نہیں، نوکیلے یا بہنگم پتھر یا ڈھلواں چٹان اس وقت بھی جہاز رانی کے لیے ندیوں کو ناموزوں بنا دیتے ہیں جب کہ ان میں پانی بہتا ہو!

اگرچہ ہماری ندیاں قدرتی اعتبار سے موزوں نہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ انسانی دانش مندی اور موجودہ فنی عہد کی ترقیوں سے فائدہ اٹھا کر بھی ہم اپنی ندیوں کو جہاز رانی اور (جہاز رانی کے ذریعے) معاشی ترقی اور مادی مزہ الحالی کے لیے موزوں نہیں بنا سکتے۔ آر تھر کاٹن نے ۱۸۷۵ء میں ایک پبلک اعلان اور متعدد پرچاری لکچروں اور سنجیدہ رسالوں کے ذریعے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ تین کروڑ پونڈ (تقریباً چالیس پینتالیس کروڑ روپیہ) کے صرفے سے ہندستان کی ندیوں کو جہاز رانی کے قابل بنا کر اور کہیں کہیں مصنوعی نہروں سے ملا کر ہماری آب راہوں کو اس قابل بنا سکیں گے کہ گنگا اور انڈس کو ملا کر کلکتہ سے کراچی تک گوداوری اور تپتی کو ملا کر (COCANDA) کو کناڈا سے سورت تک مسافر کشتیاں اور مال کے جہاز آجاسکیں۔ مگر یہ اسکیم نہ تو مقبول ہو سکی اور نہ سرکاری توجہ کی مستحق تصور کی گئی کیونکہ انگلستان کی پبلک (جو بہر حال ہندستان کی حاکم ہو) اس اسکیم کی اہمیت کو محسوس نہ کر سکی اور ریلوں کے نمائندے اور ریلوں سے وابستہ ہستیوں نے سخت مخالفت کی ۱۹۱۶ء کی ”صنعتی کمیشن“ (جس کے ہندستانی ارکان پنڈت مدن موہن مالویہ اور سر فضل بھائی کریم بھائی بھی تھے) نے حکومت ہند سے یہ سفارش کی تھی کہ ہندستانی آب راہوں کو بہتر بنا یا جائے کیونکہ ریلوں سے وابستہ غرض مندوں نے ہندستان کے پانی کے راستوں کو سرکاری توجہ سے

محروم کیا تھا۔ اور اس لیے بھی کہ ہندستان کے راستوں کو ترقی دینا تو درکنار ان کی حفاظت کرنے والا کوئی نایندہ بھی نہیں تھا! جیسا کہ موجودہ زمانے میں اکثر ہوتا ہے، سرکاری کمیشنوں کی رویداد تو ضخیم جلدوں میں شائع کی جاتی ہے، مگر ان پر عمل کی نوبت بہت کم آتی ہے۔ چنانچہ اس کمیشن کا بھی یہی حشر ہوا، کسی نے کچھ نہ کیا۔ ساری رویداد دھری رہ گئی بلکہ ہندستانی جہاز سازی اور جہاز رانی میں تنزل کی رفتار اور تیز ہو گئی اس کی اہل وجہ یہ ہے کہ جب سے دھانی جہاز کی ایجاد ہوئی اور اس کا رواج بڑھا بادبانی جہازوں کی اہمیت کم ہوتے ہوتے ناقابل لحاظ اور بین الاقوامی تجارت اور نقل و حمل کے نقطہ نظر سے مفقود ہو گئی۔ اٹھارھویں صدی میں بھاپ کی قوت معلوم ہوئی اور اس سے کل پُر زے چلائے جانے لگے، پھر انجن بنا اور خود متحرک سواریوں کے وجود میں آنے کے بعد صرف وقت کا سوال رہ گیا کہ بھاپ کی قوت کو جہازوں کے لیے استعمال کیا جائے چنانچہ ۱۷۸۶ء میں سمٹلن کی ابتدائی کوشش کے بعد اور کئی گنا مگر بد قسمت افراد کی فن دانی سے فائدہ اٹھا کر فلٹن نامی امریکن نے ۱۷۸۹ء میں سب سے پہلے ہڈسن ندی پر دھانی جہازوں کو چلانے میں کامیابی حاصل کی۔ ایک سال بعد ہی نیویارک سے انگلستان تک بھاپ کی قوت سے چلنے والے جہاز نے پہلی مرتبہ سمندر کو پار کیا، اگرچہ اس دھانی جہاز میں پردے بھی لگے ہوئے تھے اور وہ درحقیقت نیم بادبانی اور نیم دھانی جہاز تھا، مگر اس میں شک نہیں کہ وہ بغیر پردوں کے بھی چل سکتا تھا اور یہ پردے محض ہمارے کے لیے لگائے گئے تھے، میکینیت اور فن کاری کی ترقی کے ساتھ ساتھ زیادہ طاقتور انجن بننے لگے اور بادبانی جہازوں کی ضرورت و افادیت گھٹتے چھٹتے تقریباً مفقود ہو گئی۔ دھانی جہازوں کی ایجاد کے بعد چوتھائی صدی کے اندر ہی

نہ صرف مسافر جہاز بلکہ مال جہاز اور جنگی جہاز بھی تمام تر بھاپ کی قوت سے چلنے والے بنائے گئے اس عرصے میں لوہے اور فولاد کا استعمال بھی بہت بڑھ گیا تھا اور جہازوں کے بنانے میں لکڑی کی بجائے لوہا اور فولاد استعمال ہونے لگا تھا غرض انیسویں صدی کے ختم تک لوہے کے بنے ہوئے دھاتی جہازوں نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ باوبانی جہازوں اور لکڑی کے بنے ہوئے جہازوں کی اہمیت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

جدید زمانے میں مشرقیوں کا دخل میکائینیت اور فن کاری میں کچھ نہ تھا، چنانچہ ہماری جہاز سازی کی صنعت اور جہاز رانی کی صلاحیت جو کئی صدیوں سے زوال پزیر تھی موت کے شکنجے میں گرفتار ہو گئی اور بھاپ کی قوت اور لوہے کے دباؤ سے اچھی طرح کچلی گئی، ہمارے جہازوں پر جو پٹا پڑی تھی اس سے رہائی کوئی دلا سکتا تھا تو وہ حکومت تھی مگر جب تک اور جہاں کہیں ہماری حکومت تھی سب پر غفلت طاری تھی جہاں کہیں پریسیوں کا راج قائم ہو چکا تھا سربکاری اغراض اور مفاد کے خلاف تھا کہ ایسی صنعتوں کو سنبھالا جائے غرض اپنوں کی غفلت اور غیروں کی مخالفت کی وجہ سے ہندوستانی جہاز سازی اور جہاز رانی کا ایسا خاتمہ ہوا کہ اب ہمارے پاس نہ بیڑہ ہو نہ جہاز ہیں، نہ ملاح ہیں نہ ناخدا ہیں! جو نام نہاد ”ہندوستانی“ کمپنیاں ہیں وہ غیروں کے قبضے یا اثر میں ہیں ان کے جہاز غیر مالک سے خرید کر وہ جہاز ہیں، ان کو چلانے والے اور ان کے کاروبار کو سنبھالنے والے اغیار ہیں!

اسی کا نتیجہ ہو کہ سمندری آمد و رفت یا نقل و حمل میں ہمارا مطلق دخل نہیں رہا البتہ ساحلی آمد و رفت یا نقل و حمل میں ہندوستانی کشتیوں کا تھوڑا بہت حصہ ہو اور اندازہ کیا گیا ہو کہ ساحلی آمد و رفت اور تجارت میں (زیادہ تر ارموٹ قسم کی

بنی ہوئی کشتیوں کے ذریعے) ہمارا حصہ صرف دو فی صد ہی یہ بھی اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندستان سے جہاز رانی کے ذریعہ ۷۵ کروڑ کی سالانہ آمدنی ہوتی ہے جس میں پچاس کروڑ سراسر بیرونی اور غیر قومی کمپنیوں کے حصے میں جاتا ہے۔ یہ اندازے باجی صاحب نے کئے ہیں جنہیں جہاز رانی کے مسئلے سے گہری دلچسپی اور ماہرانہ واقفیت ہے۔ موصوف نے جہاز رانی سے متعلق مسائل پر متعدد مضمون لکھے ہیں عوام کی دلچسپی بڑھانے کے لیے پبلک تقریریں کی ہیں، قانون ساز جماعتوں میں قانونی مسودے پیش کیے ہیں اور ”معاشیات جہاز رانی“ کے نام سے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ ایسے واقف کار شخص کے اندازوں کو جھٹلایا نہیں جاسکتا جنگ عظیم سے قبل جہاز رانی اور جہاز سازی کی جو صورت حال تھی اُسے رادھا کو دکر جی نے ”ہندوستانی جہاز رانی اور سمندری جدوجہد کی تاریخ“ میں بیان کیا ہے، اس تصنیف کے خاتمے میں موصوف نے لکھا تھا کہ :-

”بیس صدیوں کی طویل اور شاندار تاریخ کے بعد ہماری قومی صنعتوں میں

سے ایک بڑی صنعت (جہاز سازی) گزر گئی۔ وہ بلاشبہ ہندوستانی تمدن کا

ایک کارنامہ تھا..... آج ہندستان اس اہم قومی صنعت سے محروم ہے....

گورنمنٹ اور ہندستان کی آدمی ترقی میں دلچسپی رکھنے والوں کا فریضہ ہے کہ

اس کھوئی ہوئی صنعت کو زندہ کرنے اور جدید اصولوں پر چلانے کی ضرورت

اہمیت کا اندازہ کریں کیونکہ اس صنعت ہندستان کی معاشی ترقی کی امیدیں بستھیں۔“

ان جملوں کو لکھے ہوئے تیس سال گزر چکے مگر آج بھی ان کو دہرانے اور بار بار کہنے کی

ضرورت ہے تاکہ دردمند دلوں میں قوت عمل پیدا ہو اور وہ ہندستان کی ہر اصلاح و ترقی

میں اس صنعت کو اُس کی اہمیت کے شایان شان جگہ دینے کی کوشش کریں۔

تیسرا باب

ریل کی ایجاد، رواج اور ترقی

اٹھارہویں صدی کے آخر تک بحیرہ بانی جہازوں کے تمام نقل و حرکت جانداروں کی قوت سے ہوتی تھی۔ انسان اور حیوان محنت کرتے تھے اور دنیا کا تمام کام بُرے پھلے بناتے تھے ہمیشہ سے انسان کو آرزو رہی ہوگی کہ وہ خاموشی سے بیٹھا رہے یا برائے نام نگرانی کرتا رہے اور کل پُرزے خود بخود کام کرتے رہیں۔ پانی سیندھنے، بوجھ اٹھانے، ناؤ کھینے، ٹھیلہ ڈھکیلنے سے آدمی کو طبعاً نفرت ہوتی ہو اور یہ کام عموماً وہ خوشی سے نہیں کرتا لازمی طور پر پُرانے زمانوں میں بھی لوگ ایسی قوت کا ارمان کرتے ہوں گے جو انھیں کڑی جسمانی محنت سے بے نیاز کر دے۔ اس حسرت کا پتہ ہمیں جن پری کے افسانوں سے ملتا ہو جو اپنے سردار کا حکم پاتے ہی فوراً سب کام کر دیتے تھے۔

غرض اٹھارہویں صدی تک دنیا کا بیشتر کام جان داروں کے بل بوتے پر چلتا تھا۔ جب بھاپ کی قوت دریافت ہوئی اور اُس سے کل پُرزے چلنے لگے تو صنعتی انقلاب ہوا۔ اس قوت سے فائدہ اٹھا کر خود رواجن تیار کرنا باقی رہ گیا تھا۔ چنانچہ مختلف لوگوں کی ابتدائی کوششوں اور محدود کامیابیوں کے بعد غالباً رچرڈ ٹریدی تھک نامی انگریز کو سب سے پہلے ریل کا انجن بنانے میں کامیابی ہوئی۔ اور آج ٹریدی تھک (نہ کہ جارج اسٹی فن سن) ریل کے انجن کا اہل

موجود تصور کیا جاتا ہے۔ یہ انیسویں صدی کے ابتدائی سین کا ذکر ہے۔ اس کے بعد چوتھائی صدی کے اندر ہی مختلف ریلیں جاری ہوئیں جن میں سے اکثر مقامی اہمیت رکھتی تھیں اور ٹھیک ٹھیک طور پر یہ پتہ چلانا ناممکن ہے کہ سب سے پہلی ریل کہاں اور کب چلی۔ یہ البتہ تحقیق سے معلوم ہے کہ انجن کی ایجاد اور ریل کا رواج سب سے پہلے انگلستان میں ہوا اور اس میں جارج اسٹی فن سن کا نمایاں حصہ ہے۔ اسٹی فن سن کا بنایا ہوا انجن ”راکٹ“ بہت مشہور ہے۔ یہ انجن چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار حاصل کر کے سب سے بازی لے گیا تھا۔ اس تیز رفتار کا احساس اس حقیقت سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ آج دہلی اور حیدرآباد کے درمیان ایک ہزار سے کچھ زیادہ کا فاصلہ طو کرنے کے لئے پچیس گھنٹے سے زیادہ وقت درکار ہے اور تقریباً اٹھائیس میل فی گھنٹہ کی اوسط رفتار سے مسافت طے ہوتی ہو گویا ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی ہماری اوسط رفتار راکٹ سے بارہ میل کم ہی ہے۔

اگرچہ ریل کی ایجاد ۱۸۲۵ء اور ۱۸۲۵ء کے درمیان مسلمہ ہے مگر ۱۸۲۵ء تک گھوڑے گاڑیاں برابر چل رہی تھیں اور انہیں کے ذریعے تمام آمد و رفت جاری تھی۔ چوکرٹے، بگیاں اور ایک گھوڑے کی گاڑی بدستور تھیں۔ دراصل انیسویں صدی کے آخری نصف میں ان پر آفت آئی اور آہستہ آہستہ گھوڑے گاڑی کی اہمیت ساری دنیا میں گھٹتے گھٹاتے تقریباً مفقود ہو گئی۔

بطا ہر تو یہ معمولی بات معلوم ہوتی ہے کہ نئی ایجاد کے سامنے پرانے ذرائع آمد و رفت اور نقل و حمل بتدریج مفقود ہو گئے مگر حقیقت یہ ہے کہ متعدد تجربوں اور پی در پی ناکامیوں کے بعد ان تھک محنت اور مسلسل کوشش کرنے سے

ہی ریلیں جاری ہو سکیں۔ موجودوں کو سرمایہ داروں کے سامنے ہاتھ پھیلا نا پڑا، ماہر و
اور واقف کاروں کو کم سمجھ مگر با اثر ہستیوں کی دربار داری کرنی پڑی اور انھیں خوشامد
اور لجاجت سے سمجھانا اور منا پڑا۔ ریل کی ایجاد کے وقت بھی تاریخ خود کو دہرا رہی تھی؛
اہل کمال بے مہروں اور ناقدر دانوں کے سامنے توجہ اور امداد کی بھیک
مانگنے پر مجبور تھے۔

بہر حال جب ریل جاری ہوئی تو حسب معمول حکام وقت اس نئی ایجاد کی
طرف سے غافل رہے، حرب معمول بے کار لوگوں نے پھبتیاں اڑائیں، معمول
نام نہاد ”محققوں اور عالموں“ نے گوناگوں اعتراض کیے اور اس نئی ایجاد سے
پیدا ہونے والے خطرے بیان کیے، کسی نے کہا کہ ساری فضا دھوئیں سے خراب
ہو جائے گی، تیز رو سواروں میں بیٹھنے سے سر میں خون جم جائے گا جو کچھ یورپ لوں
نے نہیں کہا مشرقیوں نے کہ سنایا؛ کسی نے کہا کہ وزنی انجنوں کے چلنے سے
زمین ہلے گی اور زلزلے آئیں گے؛ ایک ”پروفیسر“ نے کہا ہی نہیں بلکہ لکھا
بھی ہے کہ ریلوں کی وجہ سے — یورپ پھیلے گا۔ کیونکہ ریل کے ہموار راستوں
کو بنانے کے لیے پٹری کے قریب گڑھے کھودے جاتے ہیں جن میں پانی جمنا،
مڑنا اور لیریا پھیلاتا ہے۔ گویا سارے ملک میں پہلے نہ تو کوئی گڑھا تھا اور نہ کسی اور
مقصد کے لیے گڑھا کھودا گیا تھا جس سے پٹریوں کی تعداد بڑھتی اور لیریا پھیلتا!!
ریل کی ایجاد اور رواج پر بعض قدامت پرست طبقے بہت نالاں تھے اور انھیں
کی کارستانیوں سے کسی با اثر لوگوں نے ریلوں کی جاہلانہ مخالفت کی؛ جو خود کو
ضرورت سے زیادہ عقل مند سمجھتے تھے وہ انجن کو ”غریب“ تصور کرتے تھے کیونکہ
انھیں یقین تھا کہ انجن میں بڑی چالاکی سے گھوڑے کو چھپا رکھا ہے؛ جو ضرورت سے
زیادہ سمجھدار تھے وہ انجن کو ساحری سے تعبیر کرتے تھے؛ عرصے تک یہ مخالفتیں

ہوتی رہیں مگر علوم و فنون کا کارواں ان جاہلوں کے بھونکنے اور چیخنے کو نظر انداز کرتا ہوا بند ریل ترقی کرتا گیا۔

عوام کی باضابطہ آمد و رفت کے لیے سب سے پہلی ریل ۱۸۲۵ء میں یورپول سے فورٹھ نامی مقام تک چلی۔ اس کی کامیابی کے بعد انگلستان کے مختلف حصوں میں ریل ڈالی گئی، ہر سال انجن کی طاقت اور سرعت میں ترقی ہوتی گئی، ریل کے ڈبے بہتر ہوتے گئے، عام انتظام سنبھلتا گیا، انگریزوں کی دیکھا دیکھی آسٹریا میں بر اعظم یورپ کی پہلی ریل جاری ہوئی، ایک سال بعد ہی ۱۸۳۸ء میں جرمنی کی سب سے زیادہ ترقی پزیر ریاست پرورشیا میں ریل جاری ہوئی۔

ان ملکوں میں بھی ریلوں کی مخالفت اور حکومت کی بے توجہی سے ثابت ہوا کہ تاریخ خود کو دہراتی رہتی ہے۔ اس وقت کی ایک سرکاری تحریر واقف کار حلقوں میں بہت بدنام ہو۔ پرشیا کے پائے تخت برلن سے ایک قریبی شہر پوسڈام تک ریل جاری کرنے کی اجازت مطلوب تھی۔ درخواست میں ریلوں کا فائدہ بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس کی وجہ سے برلن سے پوسڈام کا فاصلہ طے کرنے میں ایک گھنٹہ بچے گا۔ مستقبل شناس ”بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے اس درخواست کے حاشے پر لکھا :-

”محض ایک گھنٹہ قبل پوسڈام پہنچنے سے میں کسی خاص مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتا“

مطلب یہ کہ ریل ویل بیکار ہو۔ جلد پہنچنے پہنچانے سے کیا ہوتا ہو؟ بادشاہ نے لکھنے کو تو لکھ دیا مگر خود اسے بہت جلد یہ تلخ تجربہ ہوا کہ بھاپ کی طاقت کے سامنے انسان کی قوت بیچ ہو۔ چاہے وہ بادشاہ وقت ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ کئی لوگوں کے اصرار سے مجبوراً اجازت دی گئی اور بادشاہ کی مرضی اور بعض حاکموں

کی مخالفت کے باوجود ریل جاری کی گئی غنیمت ہو کہ حکومت کو بہت جلد احساس ہوا کہ یہ چیز رکنے والی نہیں لہذا بہترین صورت یہی ہو سکتی ہو کہ اس پر بھی سسنگرانی قائم کر دی جائے۔ چنانچہ جلد ہی ایک قانون نافذ کیا گیا اس کے بموجب حکومت کو میاں تک اختیار عطا کیا گیا کہ وہ مقررہ وقفہ کے بعد یا کافی مہلت دے کہ مناسب شرائط کے ساتھ خانگی ریل خرید سکتی ہو۔

انگلستان اور جرمنی کا تجربہ یورپ اور امریکہ کے اکثر ملکوں میں ہوا۔ ہر جگہ ریل کو جاری کرنے میں ابتدائی دقیقیں ہوئیں، ہر جگہ حکومت کی غفلت و لاپرواہی کا سامنا کرنا پڑا، ہر مقام پر عوام کی جاہلانہ مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ ان رکاوٹوں کے باوجود ریلوں کی ابتدا ہوئی، ان کا رواج بڑھا، انھیں ترقی ہوئی، ان کو سیاست اور تجارت پر تسلط حاصل ہوا، فوجی نقل و حرکت میں اتنی آسانی ہوئی کہ ملکوں کے نقشے بدل بدل گئے۔ سیاست اور معیشت پر ریلوں کی حکمرانی انیسویں صدی کے ختم تک عالم آشکارا ہو گئی تھی نقل و حمل اور آمد و رفت کا اہم ترین اور لاثانی ذریعہ ریل بن گئی تھیں بحیثیت مد مقابل کوئی ان کی پانسنگ کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا اور موجودہ صدی کے آغاز پر یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ان کی تہا حکمرانی نہ جانے کتنی صدیوں تک رہے گی۔

ریلوں کا چلن خانگی کمپنیوں کی وجہ سے ہوا | یہ تو ہم کہ چکے ہیں کہ

فروغ دینے اور ان کو چلانے میں خانگی افراد اور خانگی کمپنیوں کا حصہ تھا۔ آسٹراک (سابق آسٹریا) میں جب ۱۸۳۷ء میں پہلے پہل ریل جاری ہوئی تو وہ بھی ایک خانگی کمپنی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح فرانس، ہنگری، اطالیہ اور متحدہ امریکی ریاستوں میں عمل ہوا۔ اگرچہ ابتدا خانگی کمپنیوں نے کی مگر بہت جلد حکومتوں کو ریلوں

کی اہمیت کا احساس ہوا۔ چار و ناچار انھیں تسلیم کرنا پڑا کہ نقل و حرکت آمد و رفت کے اس انقلاب آفریں ذریعے سے پبلک اغراض وابستہ ہو چکے ہیں لہذا انھیں بالکل خالص کامیابیوں کے تفویض نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ سب سے پہلے انگلستان میں اس کے بعد بتدریج بقیہ ملکوں میں ریلوں پر سرکاری نگرانی قائم کی گئی، آمد و رفت اور نقل و حمل کی انتہائی مشرعیں مقرر کرنے میں حکومت نے خود کو ذمہ دار بنایا۔ مقررہ شرائط کے تحت ریلوں کو خرید لینے کا حق معاہدے میں منظور اور قانونی اعتبار سے محفوظ کر لیا گیا۔ سرکاری نگرانی کی ضرورت سب سے زیادہ اس وجہ سے ہوئی کہ ریلوں کے راستوں کو سطح کرنے، لوہے کی پٹریاں ڈالنے اور اسٹیشنوں کے بنوانے میں بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے لہذا غیر ضروری یا زائد ریلوں کو روکنے کے لیے ٹرکیں نگرانی اور حکومتی تنظیم لازمی ہے۔ منظور شدہ تنظیم کے تحت ریلوں کی تعمیر مفید ہو سکتی ہے ورنہ غیر ضروری ریلیں ہی نہیں بلکہ متوازی ریلیں بھی بننے لگیں گی، متوازی (یعنی برابر جانے والی) دو مختلف ریلیں جاری کرنا قومی دولت کا دیوالہ نکالنا ہے اس احساس کے ساتھ ریلوں کی تاریخ کا دوسرا دور شروع ہوا اور سرکاری نگرانی میں یا سرکاری امداد سے ریلوں کی تعمیر و توسیع ہونے لگی جو ترقی کر کے ”سلطنتی اشتراکیت“ State Socialism کا عمدہ نمونہ ہو گیا ایک ایک کر کے حکومتوں نے ریلوں کو خریدنا شروع کیا اور کئی ملکوں کی ریلیں سرکاری ملکیت ہو گئیں اور ریلوے کا انتظام سرکاری محکمے کے سپرد کیا گیا، چنانچہ انگلستان، فرانس اور متحدہ امریکی ریاستوں کے علاوہ تمام بڑے بڑے ملکوں میں ریلوں کا انتظام اور ملکیت سرکاری ہی۔ انگلستان، فرانس اور متحدہ امریکی ریاستوں میں بھی ریلوں پر سرکاری نگرانی اور ان کے کاروبار میں سرکاری مداخلت برابر بڑھ رہی ہے بعض موقوفوں پر ریلوں کا تمام کاروبار خود سرکار نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ چنانچہ

مملکتان جیسے سرمایہ دار اور قدامت پرست ملک نے گزشتہ جنگ عظیم میں یوں
 کو سرکاری طور پر چلایا تھا اور مالک کمپنیوں کو اتنا ہی منافع دیا گیا تھا جتنا انہیں
 جنگ سے قبل ملا کرتا تھا۔ یہ سراسر حکومتی اشتراکیت کے اصول پر عمل کرنا ہی
 اگر یہ طریقہ بھی سرکاری اشتراکیت کا پیش رو نہیں تو سرکاری اشتراکیت پھر
 کسے کہتے ہیں؟



چوتھا باب

ہندستان میں ریلوں کی سرگزشت

ہندستان میں ریل جاری کرنے کا خیال سب سے پہلے انگریز تاجروں کو ہوا۔ چنانچہ منچسٹر کے، رومی کے تاجروں نے بعض انجینئروں اور کاروباری قضیت رکھنے والوں کو اس غرض سے ہندستان روانہ کیا تاکہ وہ اندرون ملک در بند گاہوں کے درمیان ریلوں کی تعمیر اس کی افادیت اور کاروباری نقطہ نظر سے نفع بخش امکان پر اپنی رائے پیش کریں۔ ان تاجروں کو اچھی طرح خیال تھا کہ سستے ذریعہ نقل و حمل کی وجہ سے خام پیداوار کے منگوانے اور تیار شدہ مصنوعات کو ملک کی اندرونی منڈیوں تک پہنچانے میں نہ صرف سہولت بلکہ کفایت بھی ہوگی۔

اسی خیال کی تصدیق کے لیے انھوں نے چند ماہروں اور وائف کاروں کو ہندستان روانہ کیا۔ ان لوگوں نے ۱۸۴۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس چند تجویزیں بھجوائیں۔ اس زمانے میں ہندستان پر راج کرنے والی جماعت خود تاجر کمپنی تھی۔ انگریزی تاجروں کی خوش قسمتی سے بہت جلد ایک ایسا گورنر جنرل ہندستان کا حاکم بنایا گیا جسے ریلوں کی ضرورت و اہمیت کا خیال تھا۔ لارڈ ڈولہوزی کا تقرر ۱۸۴۵ء میں ہوا۔ دوسرے ہی سال ہندستان میں ریلیں جاری کرنے کے لئے دو انگریز کمپنیوں سے معاہدے ہوئے جن کی متاثر ترین خصوصیت ”منافع کی ضمانت“ تھی یعنی حکومت ہند نے ریلوے کمپنیوں کو یقین دلایا تھا کہ منافع نہ ہونے یا نقصان

ہونے کی صورت میں سرکاری بخوری سے انھیں اتنی رقم دلائی جائے گی کہ ان کمپنیوں کو اپنی لاگت پر کم سے کم ۵ فی صدی منافع وصول ہوگا، معاہدے میں ریلوں کے لیے ضروری زمین مفت دینے کا اقرار کیا گیا تھا، ان معاہدوں کی تیسری ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ پانچ فی صد سے زیادہ نفع ہو تو کمپنی اور حکومت ہند کے درمیان آدھا آدھا منافع تقسیم ہوگا، گویا نقصان ہو تو کل باہر سرکار اٹھائے، فائدہ ہو تو سرکار صرف فائدے میں شریک بنے۔

ریلوے کمپنیوں کے لئے ان حسب مراد شرائط کے تحت سرمایہ کا حاصل کرنا کیا دشوار تھا۔ غرض بہت جلد ایسٹ انڈیا ریلوے اور گریٹ انڈین پینسینولا ریلوے کمپنیاں وجود میں آئیں، ریل کے کٹے بننے لگے اسٹیشن بنے، پلوں کی تعمیر ہوئی، انگلستان سے ڈبے اور انجن آئے اور سب سے پہلے ۱۸۵۳ء میں کلکتہ سے مرزا پور تک سنو میل لمبی ریلوے لائن تیار ہوئی اور باضابطہ طور پر ریلوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ یہ ریل ای۔آئی۔آر نے چلائی تھی۔ اسی نام سے آج بھی دہلی سے کلکتہ تک اور تمام یو۔پی، بہار، اڑیسہ میں ریلیں چلتی ہیں۔ اُسی سال جی، آئی، پی ریلوے نے ممبئی اور کلیان کے درمیان ریل جاری کی اور ان کامیاب تجربوں سے متاثر ہو کر لارڈ ڈالہوزی نے اُسی سال ایک یادداشت مرتب کی، جس میں ضمانت کے طریقے کے تحت ریلیں جاری کرنے کی افادیت، ریلوں کی فوجی اہمیت، تجارتی منفعوت اور انتظامی ضرورت کو بیان کیا۔ اکثر کتابوں میں اس یادداشت کا ذکر ہوا ہے ”مشہور یادداشت“ یا ”اہم یادداشت“ کہا گیا ہے مگر میں نے کہیں بھی اس کو جزوی یا کلی نقل کیا ہوا نہیں دیکھا۔ راتم کو باوجود تلاش اور کوشش کے ناکامی ہوئی۔ مکن ہو کہ یادداشت اتنی اہم نہ ہو جتنی کہ ظاہر کی جاتی ہو، بہر حال وہ گورنر جنرل کی مرتبہ تھی اور اسے قبول کر لیا گیا۔ چنانچہ

ریلوں کی تعمیر و توسیع میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا گیا ۱۸۵۲ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیان کئی ریلوے کمپنیوں سے معاہدے ہوئے۔ اسی زمانے میں بی، بی، اینڈ سی آئی، ای۔ بی اور ایس آئی ریلیں وجود میں آئیں۔

ہر ریلوے کمپنی کو سرکاری طور پر ۲۵، ۳۵ یا پانچ فی صد منافع کی ضمانت دی گئی، نگرانی اور معینہ مدت کے بعد خریدنے کا حق سرکاری ہوتا، مگر انتظام تمام تر کمپنی کا رہا، البتہ شرح نقل و حمل اور آمد و رفت کو معین کرنے کا سرکاری حق بھی مسلمہ رہا، اگرچہ معاہدے ۹۹ سالہ مدت کے لیے کیے گئے تھے مگر پچیس یا پچاس سال کے بعد ریلوے کو خرید لینے کا بھی حق طرہ پایا تھا۔

۱۸۵۲ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیان یہی اصول ضمانت کا رہا مگر جب بعض دردمند حاکموں کو خیال ہوا کہ یہ ضمانتی طریق سراسر کمپنیوں کے حق میں ہو اور کم سے کم آئندہ غیر ضمانتی طریقہ نافذ کرنا چاہیے تو انگلستان کے سرمایہ داروں اور ہندوستان کی ریلوے میں پونجی لگانے والوں نے ذاتی اغراض کی بنا پر ہنگامہ برپا کیا۔ ہندوستان کی حکومت کو جو غدر کے بعد کمپنی کے ہاتھ سے نکل چکی تھی مجبوراً غیر ضمانتی طریقے میں یہ ناموافق ترمیم کرنی پڑی کہ حکومت بیس سال تک فی میل سالانہ ۱۰۰ پونڈ تک بشرط ضرورت امداد دے گی۔ چند کوششوں کے بعد یہ طریقہ ناکام ثابت ہوا۔

برطانوی سرمایہ داروں کو ضمانت کا مزا لگ چکا تھا وہ کسی ناموافق تو درکنار کم موافق معاہدے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے آخر ۱۸۶۹ء میں گورنر جنرل کو اعتراض کرنا پڑا کہ بغیر ضمانت کے ریلوے کو جاری کرنے کا خیال ناکام ہوا!

اس ناکامی کے اعتراض کے بعد سرکاری سطوت کو بحال رکھنے کے لیے

حکومت نے ۱۸۶۹ء اور ۱۸۸۱ء کے درمیان بطور خود ریلیں تعمیر کرائیں، اور

کفایت کے خیال سے چھوٹی لائن کا انتخاب کیا۔ یہ ریلیں سرکاری طور پر تعمیر ہوئیں اور سرکاری انتظام میں چلائی گئیں مگر جنگ اور قحط کی پریشانیوں سے تنگ آکر حکومت نے ۱۸۸۷ء کے قحط کمیشن کی سفارش کے مطابق از سر نو ضمانت کا طریق اختیار کیا۔ ۱۸۸۱ء کے بعد ضمانتی طریق کے تحت ریلوے کمپنیوں کو جو ٹھیکے دئے گئے تھے وہ ہندستان کے حق میں نسبتاً بہتر تھے شرح ضمانت بالعموم پانچ فی صد کی بجائے ۳ ۱/۲ فی صد مقرر کی گئی تھی۔

ہندستانی ریلوں کی مالی سرگزشت 'انین' صدی کے ختم تک بہت ہی یالوس کُن تھی۔ ضمانتی معاہدوں کے تحت ریلوے کمپنیوں کو قریب ادا کرتے کرتے سرکاری تجویزی خالی ہوتی جا رہی تھی۔ ریلوے کمپنیاں اس بے دریغ طریقے پر اسراف کر رہی تھیں اور ریلوے کے اعلیٰ عہدہ داروں خاص کر انگریزوں کی تنخواہیں اس قدر زیادہ تھیں کہ نفع نامکن تھا۔ نیز بعض ریلیں سرکار سے بھی تجارتی ہتکنڈے برت رہی تھیں۔ ان کی تفصیل بیان کرنا طویل عمل ہوگا اور یہ داستان ناگوار بھی ہوگی۔ صرف اس حقیقت کو معلوم کر لیجئے کہ ۱۸۵۳ء سے ختم صدی تک ریلوں پر گورنمنٹ کو چند لاکھ ہی نہیں، ایک دو کروڑ ہی نہیں، بلکہ ۵۱,۵۲,۲۰,۰۰۰ پونڈ کا نقصان ہوا جو اس زمانے کی شرح مبادلہ کے اعتبار سے پون ارب سے زیادہ یعنی ۷۷ کروڑ ۲۸ لاکھ روپیہ ہوتا ہے۔ یہ وہ خسارہ ہے جو ہندستان کو ریلوں کی "نعمت" کی وجہ سے برداشت کرنا پڑا اور علمائے معاشیات کہتے ہیں کہ ریلوں کا کاروبار تجارتی کاروبار ہی اس سے نفع ہونا چاہیے! جب "نفع بخش" تجارتی نوعیت کے سرکاری کاروبار سے نقصان ہوا تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ فوجی اور اصلاحی، تعلیمی اور تہسیری، قومی اور تمدنی، امدادی اور خیراتی کاروبار میں کیا کچھ نقصان نہیں ہوا ہوگا؟

بیسویں صدی کے آغاز سے پہلی جنگ عظیم تک ہندستان کی ریلوں میں توسیع و تعمیر کا کام تیز رفتار سے جاری رہا۔ سن ۱۹۰۰ء میں ہندستان کی کل ریلوں کی لمبائی ۲۵,۰۰۰ میل تھی۔ سن ۱۹۱۶ء تک ۱۰,۰۰۰ میل کا اضافہ ہوا۔ اس مدت کی خوش گوار خصوصیت ریلوں کی نفع بخش نوعیت ہو۔ سن ۱۹۱۶ء تک ریلوں پر گھانا ہی گھانا ہوتا چلا آیا تھا۔ سن ۱۹۱۶ء کے بعد سے خسارہ موقوف ہوا اور تھوڑی بہت آمدنی ہونے لگی جو رفتہ رفتہ سال بسال بڑھتی گئی البتہ بعض مرتبہ نقصان بھی ہوا پہلی جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد ریلوں کی آمدنی میں خاصہ اضافہ ہوا مگر اس اضافے کی اصل وجہ فوجوں کی غیر معمولی نقل و حمل تھی اگرچہ بظاہر ریلوں کی آمدنی بڑھتی رہی تھی مگر اس کا بار خود ہندستان ہی پر پڑ رہا تھا۔ ہندستان قرضہ لے کر فوجی اخراجات برداشت کر رہا تھا اس قرضے کا تھوڑا حصہ ریلوں کے ”اضافہ آمدنی“ کی شکل میں نمودار ہوا۔ ٹھیک کاروباری نقطہ نظر سے بے شک فائدہ تھا مگر قومی اعتبار سے یہ بھی مالی نقصان تھا۔ ریلوں کی آمدنی میں اضافے کا باعث یہ حقیقت بھی تھی کہ جنگ کے دوران میں مطالبات فرسودگی کے لیے کوئی رقم مہیا نہیں کی جا رہی تھی۔ تجارتی کاروبار کا یہ معمولی اور اساسی اصول ہو کہ ہر سال تجدید کے لیے مناسب رقم مہیا کی جائے۔ ریلوں کی حد تک اسٹیشن، پل، انجن، ڈبے، پٹریاں وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کو کبھی نہ کبھی از سر نو بنانا پڑتا ہو، ہر سال کچھ نہ کچھ رقم محفوظ رکھنی پڑتی ہو تاکہ اس محفوظ رقم سے پرانی اور ناکارہ ہو جانے والی چیزوں کو بنایا یا حاصل کیا جاسکے۔ اس کو اصطلاحی زبان میں ”مطالبات فرسودگی“ کہتے ہیں۔ تنگ نظری سے کام لے کر ہماری ریلوے تنظیم نے اس اہم اصول کو کسی خاص مصلحت کے تحت نظر انداز کیا۔ چنانچہ سن ۱۹۶۱ء میں ریلوں کے متعلق تحقیق کرنے کے لیے جب کمیشن بٹھایا گیا، تو اس نے صاف غفلت میں لکھا :-

”میسوں پل ہیں جو جدید ضرورت کے موافق مال گاڑی کا وزن برداشت نہیں کر سکتے، کئی میل لمبی پٹریاں ہیں، سیکڑوں انجن ہیں اور ہزاروں ڈبے ہیں جن کو از سر نو بنانے کی ضروری تاریخ مدت ہوئی گزر چکی ہے۔“

دوران جنگ میں اور جنگ کے بعد چند سالوں تک ریلوں کی بڑی خراب حالت تھی جنگ کے دوران میں ریل کا بہت کچھ سامان مصر اور شام خاص کر عراق بھی بچھا گیا تھا تاکہ وہاں ریلیں چلانے میں آسانی ہو۔ ظاہر ہے کہ ریلوں کی اس تباہ حالی کی وجہ سے مسافروں اور تاجروں کو سخت مشکلاتیں ہوئیں اور ان کی اجتماعی آواز اس قدر اہم ہو گئی کہ سرکار کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ چنانچہ سرکار نے ریلوں کے متعلق سر ولیم اگورٹھ کی صدارت میں ایک کمیٹی کا تقرر کیا جس نے ریلوں اور ریلوں کے متعلقہ مسئلوں پر تحقیق کر کے ایک کیفیت مرتب کی اس کے اہم ترین اجزاء مالیہ اور تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہندستان میں ریلوں کی ملکیت اور تنظیم کا مسئلہ

ہندستان میں ریلیں سرکاری ضمانت کے تحت جاری ہوتی تھیں۔ اس یقین کے بعد کہ چاہے بد نظمی ہو یا قحط پڑے، سر د بازاری ہو یا غیر متوقع نقصان ہو، ہر حالت میں ریلوں کو منافع ملیگا۔ یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ ہندستان میں ریلیں جاری کرنے کے لیے سرمایہ حاصل کیا جاتا۔ اسی زمانے سے ہندستان کو شکایت پیدا ہوئی تھی۔ جیسے جیسے ہندستان میں تعلیم یافتہ اور باخبر لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور ہندستان مالیات یا قومی سیاسیات کے نقطہ نظر سے تنقید و تبصرہ بڑھ رہا تھا اسی قدر ریلوں کی ملکیت اور انتظام کے بارے میں سخت اختلاف رائے پیدا ہو رہا تھا۔ معاشیات جاننے والے اور سیاسیات سے باخبر ہندوستانیوں کا کہنا تھا کہ ضمانت کے تحت کسی کاروبار کو چلانا کوئی کمال نہیں۔ ایک نااہل آدمی بھی یہ کام کر سکتا ہے، نیز

جب سرکار بہر حال نقصان برداشت کر رہی ہو اور ذمہ داری قبول کر رہی ہو تو خود ہی ریلوں کی مالک کیوں نہیں بن جاتی۔ نقادوں نے کہا کہ ریلیں غیر ضمانتی اصول پر جاری کی جاتیں یا ان پر صرف سرکاری نگرانی رہتی تو اور بات تھی: ہم کہہ سکتے تھے کہ فائدہ ہوا تو انھیں کا، نقصان ہوا تو انھیں کا: تجارتی کاروبار کو چلانا سرکار کو زب بھی نہیں دیتا اور سرکاری پریشانیوں: روز کے فساد، بیرونی خطوں کا خوف، گرائی اور قحط سالی کیا کچھ کم ہیں جو ہم ریل جاری کر کے نئی مصیبت مول لیں؟ مگر دل کو دلاسا دینے کے لیے یہ بھی امکان نہ تھا۔ حکومت نے اپنے آپ کو ایک عجیب پیچیدہ معاہدے میں مبتلا کر رکھا تھا وہ ضامن بن کر ذمہ دار تو تھی مگر ملکیت سے محروم اور کلی اختیار سے محبور! یہ عجیب دو رنگی تھی جس پر سخت شکستہ چینی کی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ عوام بھی کہنے لگے کہ واقعی یہ عجیب بات ہو یا تو فائدہ اور نقصان دونوں برابر کا ہونا تھا یا فائدہ بھی ہٹھارا اور نقصان بھی ہٹھارا:۔ یہ خوب ہو کہ نقصان کل حکومت ہند کا اور فائدے میں کمپنی برابر کی شریک! ملکیت خانگی کمپنی کی اور منافع کی ذمہ داری سرکار کی: پیہم شور کرتے رہنے اور لاکھوں اخباری مراسلوں، سیاسی تقریروں، علمی مقالوں اور عام مباحثوں میں اختلاف کرنے کا بالآخر یہ نتیجہ نمودار ہوا کہ سرکار نے ریلوں کو خرید لینا ضروری خیال کیا چنانچہ ۱۸۵۷ء میں ای، آئی، آر کا پہلا معاہدہ ختم ہوا تو سرکار نے اس ریل کو خرید لیا۔ چند سال بعد ۱۸۶۷ء میں پنجاب اور سرحدی صوبوں میں چلنے والی این ڈبلیو ریل اور ۱۸۹۱ء میں جنوبی ہند کی ریل خرید لی گئی۔ ۱۸۹۷ء میں جی، آئی، پی، آر، ۱۹۰۷ء میں بی، بی، اینڈ سی، آئی، آر اور ۱۹۱۷ء میں ایم اینڈ ایم این، آر خریدی گئیں۔ گویا ہندوستانی ریلوں کے مختلف حصے رفتہ رفتہ سرکاری ملکیت میں آنے لگے مگر ساتھ ہی محض حکومت ہند کی عنایت اور مہربانی کی وجہ

سے ایک نیا مسئلہ نمودار ہوا یعنی باوجود ریلوں کو خرید لینے کے حکومت نے اس کا انتظام سابقہ ریلوے کمپنی کے سپرد کیا! مطلب یہ کہ جاہلادہاری کا ریلوے تھاری! اپنے ایمان کے مطابق کام چلاؤ، جو کچھ بچ جائے ہمیں دے دو ورنہ تم کر ہی کیا سکتے ہو؟ ریلوں کی حد تک حکومت ہند کی یہ دوسری کاروائی تھی جس کو ہندوستانی پبلک کبھی پسند نہ کر سکی اور جس کی شدید مخالفت سیاست دانوں اور معیشت دانوں کی عظیم اکثریت نے کی۔

ہندوستانی ریلوں کی ملکیت اور تنظیم کا مسئلہ اب تک حل نہیں ہوا، خاص کر تنظیم کا مسئلہ آج بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ہندوستانی ریلوں کا انتظام آج بھی بیرون ملک کی خانگی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہو کہ پبلک کے پیہم مطالبوں سے مجبور ہو کر اور واقف کاروں کے اعتراضوں سے بچنے کے لئے گورنمنٹ خانگی ملکیت کی بجائے سرکاری ملکیت کا اصول قبول کر لے اس اصول کے تحت جب کبھی معاہدوں کے اعتبار سے گنجائش پیدا ہو، ریلیں خرید لے کر خرید کردہ ریلوں کو پھر انہیں خانگی کمپنیوں کے سپرد کر دے! اور وہ بھی ایسی کمپنیوں کے جن کی مجلس انتظامی کے معزز ارکان سب کے سب پریس میں (وہ بھی ہزاروں میل دور افتادہ ملک میں) رہنے والے تھے سرکاری ریلوں کا انتظام کرنے والوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جنہوں نے ہندوستان میں قدم بھی نہیں رکھا تھا، محض اپنے اقتدار، رسوخ، زور اور حاکمیت کا ہے ماہرہ واقفیت کی بنا پر انتظام کرنے والی مجلس کے رکن بنتے تھے۔ بظاہر تو یہ یقیناً تعجب خیز بات ہو مگر ہم جب حاکمیت اور حکومت، رعب اور مرعوبیت کا خیال کرتے ہیں تو یہ بات آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ جب ملک کا سارے کا سارا انتظام بالآخر انگریزوں کے مفاد کے مطابق کیا جا رہا تھا تو ریلوں کا انتظام بھی

انھیں کے فائدے کے لیے کیوں نہ ہو؟ یہی وجہ ہو کہ پبلک کے پیسے اصرار سے مجبور ہو کر گورنمنٹ نے ریلیں خریدنا شروع کیں مگر اپنے بجائی بندوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے انتظام انھیں کے حوالے کیا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء تک یہی صورت حال رہی کہ ملکیت خانگی ہو یا سرکاری ریلوں کا انتظام بہر حال غیر سرکاری یعنی خانگی کمپنیوں کے ہاتھ میں تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد کے زمانے میں ریلوں کی بد حالی سے پبلک اس قدر برا فروختہ ہو چکی تھی اور خود گورنمنٹ بھی اس قدر عاجز آگئی تھی کہ اُس نے ریلوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور سب سے پہلے تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جس کی سفارشوں کی بنا پر نہ صرف ریلوے بجٹ کو عام بجٹ سے علیحدہ کیا گیا بلکہ حکومت ہند نے سرکاری انتظام کا اصول بھی اختیار کیا۔

پہلی جنوری ۱۹۲۵ء کو ای، آئی، آر جو تقریباً نصف صدی پہلے ہی سرکاری ملکیت میں آچکی تھی سرکاری انتظام کے تحت لائی گئی، چھ مہینے بعد یعنی پہلی جولائی ۱۹۲۵ء کو جی، آئی، پی، آر کا انتظام بھی سرکاری کیا گیا۔

موجودہ صورت حال یہ ہو کہ سارے ہندستان کی تقریباً تمام بڑی بڑی ریلیں سرکاری ملکیت ہیں مگر سرکاری انتظام صرف ای، آئی، آر، جی، آئی، پی، آر، این، ڈبیلو، آر، اور ای، بی، آر کا ہو۔

اسی سال کی آخری تاریخ یعنی ۳۱ دسمبر ۱۹۲۷ء کو بمبئی، برہوڈا اور سنٹرل انڈیا ریلوے اور آسام بنگال ریلوے سے معاہدے ختم ہوں گے اور پوری توقع ہو کہ یہ دونوں ریلیں سرکاری انتظام کے تحت لائی جائیں گی۔ بنگال اور نارنڈ ڈیسٹرن ریلوے کے انتظام کا معاہدہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۷ء کو ختم ہو گا۔ تین سال بعد ایم اینڈ ایس، ایم، آر اور ایس، آئی، آر کا انتظام کرنے والی کمپنیوں سے معاہدے

ختم ہوں گے اور سب سے آخر میں بنگال ناگپور ریلوے کا انتظام کرنے والی کمپنی سے معاہدہ ۳۱ دسمبر ۱۹۰۷ء کو ختم ہو گا غرض پوری توقع ہو کہ دس سال کے اندر حکومت ہند کی تمام ریلیں براہ راست سرکاری انتظام کے تحت آجائیں گی۔

جیسے جیسے معاہدوں کی اختتامی تاریخ قریب آتی جا رہی ہو سرکاری اور خانگی انتظام کا مسئلہ اہم ہوتا جا رہا ہو، خانگی انتظام کے موافق افراد اپنے اپنے اغراض کے تحت کسی طرح خاموش نہیں ہیں۔ براہ راست اور درپردہ اُن کی ریشہ دوانی جا رہی ہو۔ ان کی کوشش ہو کہ جتنی ریلیں اُن کے اختیار میں کم سے کم وہی اُن کے بس میں رہیں اور معاہدے کی توسیع کر دی جائے۔ ان کا زور چلے تو وہ تمام ریلوں کو دوبارہ اپنے اختیار میں لے آئیں مگر غنیمت ہو کہ نہ صرف حکومت ہند بخوبی آگاہ ہو چکی ہو بلکہ عوام اور واقف کار بھی بڑی حد تک سرکاری ملکیت اور سرکاری انتظام کے موافق ہیں۔

خانگی انتظام کی موافقت میں حسب ذیل ”دلیلیں“ پیش کی جاتی ہیں :-

براہ راست سرکاری انتظام ہو تو حکومت کے لیے از حد دشوار ہو گا کہ تجارتی کاروبار کی حیثیت سے ریلوں کو چلائے۔ نفع بخش اصول کے اختیار کرنے میں حکومت کو بڑی دشواری ہو گی، دوسرے حکومتی محکموں کی طرح ریلوے کے محکمہ پرست کا بہت اثر پڑیگا، خالص تجارتی یا زیادہ تر تجارتی اغراض و مقاصد کے مطابق کام نہ ہو گا۔ بلکہ سیاسی اثرات کے تحت ضابطے بنائے جائیں گے۔ تسلسل خدمت اور قدامت کے اصول ریلوے پر منطبق ہوں گے۔ جن کی وجہ سے اہلیت اور قابلیت بُری طرح متاثر ہوں گی۔ کیونکہ ان اصولوں کے تحت نا اہل لوگوں کو عطا کرنا اور کم اہل لوگوں کے مقابلے میں زیادہ مستحق لوگوں کو ترقی دینا بہت دشوار ہو جاتا ہو۔ اسراف کا اندیشہ سرکاری انتظام میں زیادہ ہوتا ہو، اخراجات کے بڑھنے کا

خوف زیادہ ہی اور سب سے بڑھ کر سرکاری طور پر کسی اصول کے تعین کرنے یا فیصلہ ہونے میں بہت زیادہ دشواریاں ہوتی ہیں، ناقابل ذکر اثرات کا فرما ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ضروری فیصلوں میں بھی نقصان دہ تاخیر ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مباحثے کے طور پر مذکورہ نکات پر تبصرہ کیا جائے تو خانگی تنظیم کی موافقت میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے مگر اسی اصول پر ہم یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ آخر ریلوں ہی پر کیا موقوف ہو، ڈاک اور تفرات کا کاروبار بھی کیوں نہ کسی خانگی کمپنی کو دے دیا جائے، اس کے بعد نمک کا ٹھیکہ اور مال گزاری کا حکم، اس کے بعد اینون کی کاشت کا ٹھیکہ اور آبکاری کا گتہ، اور آب رسانی کا انتظام بھی تو خانگی کمپنیوں کو دیا جاسکتا ہے! لہذا اصولاً اگر ریلوں کا انتظام خانگی کمپنیوں کے ذریعے مفید تر ہو تو پھر ڈاک، تار، آبکاری، نمک، مال گزاری، اور آب رسانی کا انتظام بھی ہوگا مگر جب اصولی طور پر ان کا دوبارہ کو سرکار خانگی کمپنیوں کے سپرد کرنے پر آمادہ نہیں تو ریلوں کے حق میں کیوں علیحدہ طریقہ اختیار کیے؟ ریلوں کی سرکاری تنظیم سب سے زیادہ اس وجہ سے ہونی چاہیے کہ یہ ہندستان کی قومی خودداری، سیاسی سطوت اور ہندوستانیوں کے عام مفاد کے خلاف ہو کہ ریلوں کا انتظام غیر سرکاری بیرونی کمپنیاں کریں۔

سب سے پہلے سیاسی سطوت کو لیجئے۔ ہر غیور شخص اس بات کو تسلیم کرے گا کہ ہر ملک کا کاروبار اُسی ملک کے لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے جیسے جیسے ہندوستانیوں میں سیاسی سطوت کا خیال بڑھتا جا رہا ہو اُن کا یہ مطالبہ پُر زور ہوتا جا رہا ہو کہ بیرونی کمپنیوں کے ذریعے سرکاری ملکیت کا انتظام قطعاً ناقابل برداشت ہے!

اگر یہ فی الحال ناممکن ہو تو کم سے کم یہی ہونا چاہیے کہ غیروں کا عمل دخل

بڑھنے کی بجائے محدود ہو، سرکاری ملکیت پر سے بیرونی خانگی کمپنیوں کا قبضہ محل جائے، ہمیں یہ ذلت گوارا نہ کرنی پڑے کہ ہماری سرکاری ملکیت پر بھی بیرونی خانگی کمپنیوں کا قبضہ ہو۔

ان سیاسی اور قومی مفاد اور اغراض سے قطع نظر خالص کاروباری اور معاشی نقطہ نظر سے بھی سرکاری ریلوں کا انتظام سرکاری ہی ہونا چاہیے کیونکہ سرکاری تنظیم میں فوری فائیدے سے زیادہ دوامی مفاد پیش نظر ہوتا ہو، اور سرکاری تنظیم کی بدولت محکمہ داری فائیدے سے بدرجہا زیادہ قومی فائدہ اور عام مرفہ الحالی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہو۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ریلیں صرف ذریعہ مرفہ الحالی ہیں۔ ان کی وجہ سے اگر عوام کی مادی دولت اور عام مرفہ الحالی میں اضافہ ہوتا ہو تو یقیناً وہ عمدہ ہیں اور ان کا وجود نعمت ہو، ریلیں مقصود بالذات نہیں۔ یعنی محض ریلوں کو نفع بخش طریقے سے چلانا چاہیے اس کی بدولت ہندوستان کا عام نقصان ہی کیوں نہ ہو، یہ ہمارا مقصد نہیں ہو سکتا۔ قومی مرفہ الحالی کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہماری ریلوں کی روش خاص کر گزشتہ صدی اور جنگ عظیم سے قبل تک قومی مفاد کے بالکل برعکس رہی ہو۔ نیز انتظامی اختلاف کی وجہ سے ہر کمپنی نے اپنا فائدہ حاصل کرنے کے لئے قومی مرفہ الحالی کو نقصان پہنچایا اور پبلک کو پریشان کیا۔ مثلاً ہر کمپنی اپنی ریلوں پر آمد و رفت اور خاص کر نقل و حمل بڑھانے کے لیے ایسی شرح مقرر کرتی تھی جس کی وجہ سے کئی مرتبہ قریب ترین اور سہل ترین راستے کی بجائے تکلیف دہ اور دور کا راستہ اختیار کرنے میں کفایت ہوتی تھی، تاہر پیشہ آبادی اس طریقے کو بدلنے سے قاصر تھی، انھیں اس قسم کی انتہائی خود غرضانہ روش سے سخت پریشانی ہوتی تھی، انھیں نقصان بھی ہوتا تھا مگر زیادہ نقصان کے خوف سے انھیں تھوڑا

نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اس طرز عمل کو اصطلاحی زبان میں Block Rates. یعنی ”مطلبی شرح“ کہتے ہیں ایک حقیقی مثال لیجئے مثلاً میں ایک اوالوئزم کمپنی نے بمبئی اور بروج کے درمیان ساحل کے قریب قریب آنے جانے والے چھوٹے جہازوں کا انتظام کیا اور کاروبار شروع کیا، بہت جلد بی بی اینڈ سی آئی ریلوے نے محسوس کیا کہ بہت کافی مال بروج اور بمبئی کے درمیان ان ساحلی جہازوں کے ذریعے جا رہا ہے، لہذا مال کو اس رُخ سے روکنے کے لیے اس ریلوے نے ”انسدادی نرخ“ رائج کیا اور بروج سے بذریعہ ریل مال بھیجنے کا نرخ جو گنا کر دیا گیا، چونکہ اندرون ملک مثلاً راج پیپلا کو مجبوراً ریل ہی کے ذریعے مال بھیجنا پڑتا تھا لہذا ریلوں نے پانی کے راستے کو نقصان پہنچانے کے لیے بروج اور راج پیپلا کے درمیان اسی قدر شرح بڑھادی کہ اُن کے لیے بمبئی سے ہی ریل کے ذریعے مال منگانے میں کفایت ہوئی۔ ریلوے نرخوں کی اس خود غرضی سے اگرچہ مخصوص ریلوں کا موقتی فائدہ ہوتا تھا مگر پبلک کو کوفت اور نقصان پہنچتا تھا بتدریج تجارت پیشہ لوگ اور عوام سمجھنے لگے کہ کمپنی کے زیر انتظام جب تک ریلیں رہیں گی اُس وقت تک قومی فائدہ، تجارتی سہولت، صنعتی ترقی، اجتماعی مفاد کا کوئی پُرمان حال نہ ہوگا۔ ریلوں کا طرز عمل نہایت خود غرضانہ رہا ہے، ریلوں کے انتظامی فرق نے ملک کے متحدہ منفعت کو بارہا نظر انداز کیا ہے۔ انتظامی نقطہ نظر سے اور کمپنی کی ملکیت یا اقتدار کے لحاظ سے مختلف ریلوں کی آپس کی حاسدانہ چشمک سے یہ معلوم ہوتا ہے گویا پبلک کے فائدے کی خاطر ریلیں نہیں ہیں بلکہ ریلوں کے فائدے کے لیے پبلک ہی!!

ایک نئے مانے سے ہندوستانیوں کی یہ شکایت رہی ہے کہ ریلوں کے کرایے ریلوں کے مفاد اور بیرونی تجارت کو ترقی دینے کی غرض سے معین کیے جاتے ہیں۔

صنعتی کمیشن، مالیاتی کمیشن اور ایکورٹھ کمیٹی کے روبرو بھی اس شکایت کا اظہار کیا گیا۔ بندرگاہوں تک خام اشیاء پہنچانے اور بندرگاہوں سے بیرونی تیار اشیاء لے جانے کے لیے خاصے رعایتی کرایے مقرر کئے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس خود اندروں ملک ایک سے دوسرے مقام تک مال پہنچانے کے لیے ایسی سہولتیں نہیں دی جاتیں۔ اور اس کا اثر اندرونی تجارت پر بہت بڑا پڑتا ہے۔ ریلوں کے کرایے کی روش کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت ساری صنعتیں محض رعایتی کرایوں سے فائدہ اٹھانے کی خاطر بندرگاہوں میں قائم ہو گئی ہیں، یہ کوئی مناسب صورت حال نہیں۔ اس کی وجہ سے نئی نئی دستاویاں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ اندرونی علاقوں سے دور رہنے کی وجہ سے یہ کارخانے کافی تعداد میں آسانی کے ساتھ مزدور حاصل نہیں کر سکتے۔

صنعتی کمیشن نے یہ سفارش کی تھی کہ کرایوں میں دو رنگی کو ترک کیا جائے اور حتی الامکان بندرگاہوں اور اندرونی علاقوں کے لیے مساوی شرح مقرر کرنے کی کوشش کی جائے۔ مالیاتی کمیشن نے نہ صرف اس رائے سے اتفاق کیا بلکہ ایک نئی سفارش بھی کی کہ ایک مقررہ مدت کے لیے نئی صنعتوں سے رعایتی کرایے لئے جائیں۔ زرعی کمیشن نے زراعت کے محکموں اور ریلوں میں اشتراک عمل کی تجویز پیش کی اور اس پر بھی زور دیا کہ کھاد، ایندھن، چارہ اور دودھ دینے والے مویشیوں کے لیے رعایتی کرایے مقرر ہوں اس کے علاوہ زرعی مشینوں اور آلہوں کے کرایے پر نظر ثانی کرنے کی سفارش کی۔ حکومت ہند نے سن ۱۹۶۱ء میں ان میں سے چند سفارشوں کو منظور کر لیا۔ لیکن اب بھی اس کی ضرورت ہے کہ کرایوں کی جملہ شرحیں بدلی جائیں۔ اکورٹھ کمیٹی کی سفارش کی بنا پر سن ۱۹۶۶ء میں حکومت ہند نے کرایوں کی مشاورتی کمیٹی

قائم تو کر دی لیکن محض کمیٹی سے کچھ زیادہ کام نہیں چلتا۔ ضرورت تو ایک ایسے
Railway Rates Tribunal. محکمہ شرح کرایہ کی ہو جو اختلاف رائے
کی صورت میں فیصلہ کر سکے کہ مخصوص حالات کے تحت کتنی شرح نقل و حمل مناسب
ہو سکتی ہے۔

بیج قویہ ہے کہ ریلوے نرخ کے تعین کا اصول اس وقت تک قومی مفاد کے
ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ کل ریلیں نہ صرف قطعی سرکاری ملکیت ہو جائیں
بلکہ سب ایک ہی سرکاری انتظام کے تحت نہ لائی جائیں۔ پرانے زمانے کی
کمپنیوں کے اقتدار کے مناسبت سرکاری ریلوں کے مختلف نام اور علاقہ داری حد
بندیاں قائم نہیں رہنی چاہئیں۔ قواعد میں بھی فی الحال کافی اختلاف پایا جاتا ہے
انڈیون ہند ہی ”ذاتی“ اور ”پرانی“ ریلوں کا موجودہ فرق قومی معاشیات
کی نظر سے مضحکہ خیز ہے۔ اسی ایک فائدے کی بناء پر ہم خانگی تنظیم کے تمام حقیقی اور
نام نہاد فوائد کو مد نظر رکھتے ہوئے بھی سرکاری تنظیم کے حق میں فیصلہ کریں گے۔
یہ بات قطعی ہے کہ صرف حکومتوں کا مسلک ظاہر عامہ ہوتا ہے، فیروں کے ہاتھوں
میں رہنے والی کمپنیوں سے ملک و قوم کے فائدے کا خیال ہی ہٹل ہے۔ انڈا سرکاری
تنظیم کے بعد یہ توقع کی جاسکے گی کہ ریلوے پالیسی مفاد عامہ کے مطابق ہوگی
ہم نے اس سے قبل مختصر طور پر بیان کیا ہے کہ ریلیں قومی فائدے کی
خاطر ہیں، قوم ریلوں کے فائدے کے لئے نہیں ہے۔ معاشی اعتبار سے ہندوستان
کا اہم ترین مسئلہ ہمارے ملک کے افلاس کا مسئلہ ہے اور افلاس کو دور کرنے کے
لیے زراعتی ترقی کے علاوہ صنعتی ترقی اور تجارتی ترقی لازمی ہے اور صنعتی ترقی
کے لیے تائین یعنی غیر ملکی مصنوعات کے مقابلے میں ہندوستانی مال کی حفاظت
لازمی ہے۔ تائین تجارت کے اثرات اُسی وقت زیادہ ہوں گے جب کہ گاہکوں

اور خرچ کرنے والوں تک پہنچتے پہنچتے بدیشی مال مہنگا پڑے اور دیسی مال سستا پبلک ہیجان اور عوام کے مطالبوں سے مجبور ہو کر گورنمنٹ نے بعض صنعتوں کی حفاظت کے لیے تائیدی حصول تو عاید کیا مگر ریلوں کی پالیسی کی وجہ سے تائین کا مقصد زایل ہو گیا کیونکہ ہماری ریلوں کی پالیسی یہ رہی ہو کہ بندرگاہوں سے اندرون ملک تک نقل و حمل کا کرایہ کم رہے (تاکہ خام پیداوار کو بھجوانے کی ترغیب ہو اور بدیشی مال کی درآمد میں اخراجات زیادہ نہ ہوں) اور اندرون ملک کے کرلے زیادہ ہوں تاکہ ملک کی اندرونی تجارت پر بار پڑے اور اندرون ملک کا رخاٹے پنپنے نہ پائیں، ریلوں کے نرخوں کے بارے سے تائین تجارت کا بار بدیشی صنعت کے لیے ہلکا پڑ جائے اور ہر حالت میں غیر ملکوں کو مال بھجوانے اور غیر ملکوں سے مال منگوانے میں ممکنہ سہولت اور کفایت ہو۔

ہندستانی ریلوں کی داستان اسی لیے بہت تلخ ہوئی۔ اس کا وجود ہندستان میں ہمیشہ برطانوی ملوکیت کے ایک جزو کی حیثیت سے رہا۔ ہندستانی صنعت کی ترقی میں ریلوں نے جتنا ان سے ہو سکتا تھا اتنے کا نٹے بوئے۔ غنیمت ہو کہ پبلک ہنگاموں، ذمہ دار قومی اداروں کے مطالبوں اور قوم پرستوں کے اثرات سے مجبور ہو کر غیروں کا نہ وہ کچھ کم ہوا ورنہ کہیں ریلوں کی ہندستانی صنعت کو بالکل ہی کچل دیا ہوتا۔ سرکاری ملکیت ہونے کے بعد بھی کینی کا انتظام باقی رہا ہند ٹھیکہ داری کے دور میں بھی ریلوں کی سرکاری طرف داری بحال ہی ہندستانی معاشیات کے جاننے والوں نے اس راز کو بھی فاش کر دیا چنانچہ نہ صرف ہندستانی پبلک کی عظیم اکثریت بلکہ معاشیات کے جاننے والوں کی عظیم ترین اکثریت اس بات کو اچھی طرح محسوس کر چکی ہو کہ ریلوں کی پالیسی کو ہندستانی مفاد کے ہم آہنگ بنانے کے لیے ریلوں کو براہ راست سرکاری تنظیم کے تحت لانا ضروری ہو۔ بغیر سرکاری تنظیم کے ریلوں کو کچھ نہ کچھ بہانا ملتا

ہی ہے گا کہ وہ ہندوستانی مفاد کو نظر انداز کرتی نہیں، ہندوستانیوں کی ترقی میں حائل ہوں اور ہندوستانی جذبات اور احساسات کی پروا نہ کریں جس وقت تمام ہندوستانی ریلیں خالص سرکاری تنظیم کے تحت چلائی جائیں گی تو قومی مفاد کے تحت ریلوں کی حلقہ داری تقسیم آمد و رفت کے کرائے اور نقل و حمل کے نرخ معقول رکھے جائیں گے، ریلیں صرف پردیسوں کی سہولت اور بیرونی تجارت کا خیال نہ رکھیں گی، ان کو صرف حاکم اور بااثر طبقوں کے آرام کا خیال نہ ہوگا بلکہ وہ پبلک مفاد کے تحت عوام کی کفایت اور سہولت کو مد نظر رکھیں گی۔ کم سے کم اس بات کا تو یقین ہو کہ جس طرح خانگی ملکیت سے سرکاری ملکیت بہتر ثابت ہوئی اور خانگی کمپنی کی تنظیم سے لندن میں بورڈ کے ذریعے سرکاری ریلوں کی تنظیم غنیمت ثابت ہوئی اسی طرح بہترین صورت حال اسی وقت ہوگی جب کہ تمام ہندوستانی ریلوں کا انتظام براہ راست سرکار کی طرف سے کیا جائے گا اور ریلوے بورڈ بھی ہندستان ہی میں ہوگا۔

جب نکل ریلوں پر ہندوستانی حکومت کا براہ راست انتظام ہو جائے گا تو پوری توقع ہو کہ اب سے کہیں زیادہ تیسرے درجے کے مسافروں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے گا اور ان کی آسائش کا معقول خیال رکھا جائے گا، ہندستان کے قومی اداروں اور ہندوستانی کارخانوں کا فائدہ نہ صرف پردیسی تجارت پر بلکہ خود ریلوں کے فائدے پر مقدم رکھا جائے گا۔ ریلیں اس بات کو ملحوظ رکھیں گی کہ ان کا وجود صرف اسی صورت میں حق بجانب ہو سکتا ہے جب کہ ریلوں سے قومی دولت و مرفہ الحالی میں اضافہ ہو سیکے کہ تعدادی جماعت کے ساتھ بہت زیادہ حسن سلوک کرنے اور ان پر مسلسل مہربانیاں کرتے رہنے کی بجائے ریلوں کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ سب کے ساتھ انتہائی مکمل رعایت کریں۔ اسی وقت جبکہ ہماری ریلوں کا مسلک قومی فائدہ اور ان کے کاروبار اور تنظیم کا پس منظر مفاد عامہ قرار پائے گا ہمیں بھی اپنی ریلوں سے اتنا ہی فائدہ ہوگا جتنا امریکی قوم کو امریکی ریلوں سے یا جاپانی قوم کو جاپانی ریلوں سے ہو رہا ہے

ہندستان میں ریلوں کی موجودہ حالت و کیفیت

جدید ترین اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ کل ہندستان میں ۴۱،۱۳۳ میل لمبی ریلیں ہیں، ریلیں تین قسم کی ہیں، بڑی پٹری، متوسط پٹری، اور چھوٹی پٹری کی۔ بڑی پٹری کی ریلیں ۲۱،۱۶۴ میل، متوسط پٹری کی ریلیں ۱۵،۹۴۰ ہیں۔ یہ ”میٹر گج“ ریل کفایت کے لحاظ سے اور متوسط شہروں اور کم اہم علاقوں میں جاری کی گئی تھی۔ بالکل چھوٹی پٹری کی مجموعی طوالت ۱۰،۴ میل ہے۔ اس کے علاوہ ۴۰۶ میل لمبی ریلیں زیر تعمیر ہیں۔

ہندستان میں کل ۴۱،۱۳۳ میل لمبی ریلیں ہیں جس میں حکومت ہند کی ملکیت میں تقریباً ۳۰ ہزار میل ہے (۲۹،۰۷۴) سرکاری ملکیت کی ریلوں میں ۲۶،۰۲۶ میل سرکاری انتظام میں ہیں۔

حکومت ہند کی ملکیت کے علاوہ دیسی ریاستوں کی ملکیت میں بھی خاص لمبی ریلیں ہیں جن کا مجموعی میلانہ ۷،۰۸۰ ہے۔ اس میں براہ راست دیسی ریاستوں کے انتظام میں ۵،۸۹۷ میل ہے۔ چنانچہ میسور سیٹ ریلوے کا انتظام ریاست میسور کے ماتحت اور نظام سیٹ ریلوے کا انتظام ریاست حیدرآباد کے تحت ہے۔ دیسی ریاستوں کی ریلوں میں سے بعض ریلیں مثلاً بھوپال سیٹ ریلوے اور گوالیار سیٹ ریلوے ایسی ہیں جن کا انتظام جی، آئی، پی، آر کے تحت ہے۔

ہندستان کی ریلوں کو جدید ایجادوں اور فنی ترقیوں سے مستفید کرنے کے لیے بجلی سے چلنے والی ریلوں کا بھی انتظام کیا گیا۔ چنانچہ سب سے پہلے بمبئی اور آگ پوری کے درمیان اور اس کے بعد کلکان سے پونا تک ریلوں کو برقیایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ بمبئی کے قرب دجوار کی بی بی اینڈ سی، آئی ریل اور مدراس سے سے متبارام تک ۱۶ میل برقی قوت سے ریلیں چلتی ہیں۔ برقی ریل کا مجموعی میلانہ ۲۲۴ ہی ریلوں کو برقی قوت سے چلانے کے لیے نہ صرف ابتدائی مصارف زیادہ ہوتے ہیں بلکہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ بھاپ سے چلنے والے انجنوں کی حالت ایسی گئی گزری نہیں ہو گئی ہے کہ وہ برقی انجنوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ امریکہ اور انگلستان کے تجربوں سے نیز بھاپ کے انجنوں کی مزید ترقی سے برقی ریلوں کا رواج عام ہونے کی فی الحال کوئی صورت نہیں۔

امریکی ایجاد سے مستفید ہو کر ہندوستانی ریلوں میں بھی موسمی ڈبے اور اور ڈیزل گاڑیاں استعمال کی جا رہی ہیں۔ موسمی ڈبے زیادہ تر مالداروں کے فائیے کے لیے اور ڈیزل گاڑیاں کم اہم مقاموں میں مسافروں کی سہولت کے لیے جاری کی گئیں اور خاصی کامیاب ہوئیں۔

مندرجہ اعداد و شمار سے ہندوستانی ریلوں کی موجودہ کیفیت اور حالت کا اندازہ اس وقت اور زیادہ اچھی طرح ہو سکتا ہے جب ہم ان کا تقابل بعض ترقی یافتہ ممالک کے اعداد و شمار سے کرتے ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ معلوم کرتے ہیں کہ متحدہ امریکی ریاستوں میں ریلوں کی مجموعی طوالت ۲۰۶۱ / ۰۰۰ میل ہے تو ہمارے ملک کی ریلوں کی مجموعی طوالت ۱۳۳ / ۴۴ میل حقیر معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ متحدہ امریکی ریاستوں کا رقبہ ہندوستان کے رقبہ سے دو گنا ہے مگر ہمارے ملک کی آبادی ۴۰ کروڑ ہے اور متحدہ امریکی ریاستوں کی آبادی ۴۰ کروڑ۔ غرض ریلوں کے اعداد کے تقابل سے دونوں ملکوں کی معاشی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور امریکہ کی دولت و ثروت اور ہمارے افلاس و غربت کی دھندلی تصویر نظر آ سکتی ہے۔

ریلوں کی تعداد کی کیفیت تو ہم نے بیان کر دی اب اس کی موجودہ مالی حالت

سنیے۔ یہ تو ہم نے بیان کیا جو کہ سن ۱۹۰۶ء تک ہندوستانی ریلوں کی وجہ سے حکومت ہند پر ۷۷ کروڑ کا بار پڑا تھا۔ سن ۱۹۰۶ء کے بعد سے فائدہ شروع ہوا جو بعض برسوں کو نظر کرتے ہوئے سن ۱۹۲۵-۲۶ء تک ہوتا رہا۔ پہلی اپریل سن ۱۹۰۶ء کو ریلوے کا موازنہ عام موازنے سے علیحدہ کر دیا گیا اور یہ طرہ پایا کہ اکوڑھ کیٹی کی سفارش کے مطابق ہندوستانی ریلیں عام اخراجات کے لیے ہر سال اپنے سرے کا ایک فی صدی پیش کریں البتہ جو نقصان فوجی اغراض کے لیے تعمیر کردہ ریلوں کو چلانے سے ہو رہا ہو وہ نہا کر لیا جائے۔ اس کے بعد جو رقم بچ رہی ہے اس کا صرف پانچواں حصہ عام موازنے کے سپرد کیا جائے بقیہ ۳ حصہ خود ریلوں لکھیں۔ اس قرارداد کی بموجب پہلی اپریل سن ۱۹۰۶ء سے عمل شروع ہوا۔ اس سال ریلوں نے ۶ کروڑ ۸ لاکھ پونے عام اخراجات کے لیے ادا کئے اس کے بعد سے سن ۱۹۲۳ء تک ہر سال پانچ چھ کروڑ ریلوں سے ملتا رہا جو سن ۱۹۲۳-۲۴ء سے سن ۱۹۲۳-۲۴ء تک مقررہ شرطوں کے تحت ریلوں سے رقم برابر وصول ہوتی رہی مگر ریلوں کی اندرونی مالی حالت سن ۱۹۲۹-۳۰ء سے بگڑنے لگی تھی۔ چنانچہ اس سال اگرچہ ریلوں نے ۶ کروڑ ۱۲ لاکھ عام اخراجات کے لیے دیا مگر ۲ کروڑ ۸ لاکھ ریلوے بچت میں سے نکالے گئے تھے سن ۱۹۳۰-۳۱ء میں ریلوں کو ۵ کروڑ ۱۹ لاکھ کا گھانا آیا اس پر طرہ یہ کہ انہیں عام اخراجات کے لیے (۱۹۲۳) کی قرارداد کی بموجب ۵ کروڑ ۴ لاکھ دینے پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف سن ۱۹۳۰-۳۱ء میں ریلوں پر ۱۰ کروڑ ۹۳ لاکھ کا بار پڑا تھا ہر ہی کہ خسارے برداشت کرنا اور شرائط کی پابندی کرتے ہوئے پانچ چھ کروڑ ہر سال ادا کرنا ریلوں کے لیے کب تک ممکن تھا۔ چنانچہ مالی مجبور ریلوں سے پریشان ہو کر ریلوں نے پیش کش موقوف کر دیا۔ سن ۱۹۳۱-۳۲ء میں ریلوں سے کچھ نہ ملا سن ۱۹۳۲-۳۳ء میں بھی یہی ہوا سن ۱۹۳۳-۳۴ء میں بھی وزیر مالیہ ریلوں کی پیشکش سے محروم رہے۔ سن ۱۹۳۴-۳۵ء میں بھی ریلوے کے وزیر انجان بن گئے اور سن ۱۹۳۵-۳۶ء میں بھی سن ۱۹۲۳ء کی قرارداد کی خلاف ورزی کی گئی

اور ایک پائی بھی ریلیوں سے وصول نہ ہوئی۔ گویا ۶ سال تک ریلیوں نے ایک حقہ بھی ادا نہیں کیا۔ ۱۹۳۷-۳۸ء میں ریلیوں کو کچھ منافع وصول ہونا شروع ہوا۔ چنانچہ ۱۹۳۷-۳۸ء میں وہی پانچ سو روڑ کی ادا طلب رقم میں سے ۲ کروڑ ۷۶ لاکھ ادا کیے گئے اور ۱۹۳۸-۳۹ء میں تو صرف اکروڑ ۳ لاکھ -

اسی طرح عدم ادائیگی یا کم ادائیگی کی وجہ سے ریلیوں کے ذمہ ادا طلب رقم ۱۹۳۱-۳۲ء سے برابر بڑھتی گئی اور عام اخراجات کے لیے پہلی اپریل ۱۹۳۹ء کو ان سے کل ۳۵ کروڑ ۳ لاکھ وصول طلب تھے ریلیوں پر صرف اسی قدر رقم کی ادائیگی کا بار نہیں ہو۔ ہم نے بیان کیا ہے کہ ریلیوں کی اندرونی مالی حالت ۱۹۳۹ء سے بگڑنے لگی تھی چنانچہ اسی سال کچھ رقم ریلوے بجٹ سے نکالی گئی تھی۔ دوسرے سال ریلیوں کو گھٹا آیا اور خساروں کا تسلسل ۱۹۳۷-۳۸ء میں جا کر ٹوٹا اور ریلیوں کو بھڑکاسا منافع ہوا۔ مگر چھ سال کے مسلسل خساروں سے ان کی بچی بچائی پونجی ختم ہو چکی تھی غیر ادائہ پیش کشوں کا بار الگ تھا، اقرار نامے کی خلاف دزدی بھی ہوئی تھی 'غرض ریلیوں کی مالی حالت کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۳۱-۳۲ء اور ۱۹۳۷-۳۸ء کے درمیان بجٹ سے خرچ کی ہوئی رقم ۳۵ کروڑ ۳ لاکھ ہو اور ۱۹۳۱-۳۲ء کے اقرار نامے کی بموجب جو سالانہ پیش کش دینا ہو اس کی مجموعی رقم ۳۰ کروڑ ۲۹ لاکھ ہو گویا ریلیوں پر کل ۶۵ کروڑ ۶۶ لاکھ کا بار ہو جس میں سے ۳۵ کروڑ ۳ لاکھ محفوظ ہیں واپس کرنا ہے اور ۳۰ کروڑ ۲۹ لاکھ عام اخراجات کے لیے ادا شدہ ہیں۔

اگرچہ ریلیوں کی آمدنی میں اضافہ شروع ہو گیا ہے مگر فراین کو مد نظر رکھتے ہوئے جنگ کے بڑھتے ہوئے بار کو خیال کر کے یہ بالکل ناممکن ہے کہ آئندہ پندرہ بیس سال میں ریلیں اتنا کماسکیں کہ وہ نہ صرف ہر سال کی ادائیاں کر سکیں بلکہ گزشتہ سینیں کے مطالبے بھی پورے کر دیں۔

اسی لیے تجویز کی گئی ہو کہ گزشتہ حساب کتاب کو ختم کر کے از سر نو حساب شروع کیا جائے۔ چنانچہ اور تو اور خود ریلوے ممبر نے ۱۹۳۷-۳۸ میں ریلوے بجٹ پیش کرتے ہوئے کہا تھا :-

”ریلوں کے لیے ناممکن ہو گا کہ وہ کسی معقول مدت میں جس کی پیش بینی ممکن ہو عام موازنے کے لیے از سر نو ادائی شروع کر سکیں۔ ان حالات میں سب سے زیادہ عقلمندی کی بات تو یہ ہو کہ جتنی رقم ذمہ داریاں ہیں وہ قلم انداز کر دی جائیں اور آئندہ سال سے جہاں تک ان ذمہ داریوں کا تعلق ہو ایک صاف ہی کھاتے میں حساب کتاب از سر نو شروع کیا جائے“

بات تو ریلوے ممبر نے اپنے زاویہ نگاہ سے معقول کہی تھی۔ گزشتہ قرضوں کے بارے میں ریلوے کو سبک دوش کرنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس رقم کو عام قرضے میں شامل کر لیا جائے تاکہ ریلوے کی تجارتی اور نفع بخش نوعیت بخوبی واضح ہو۔ اس تجویز پر تمام قوم پرست مدبروں، صحیفہ نگاروں اور واقف کاروں نے ایک ہنگامہ برپا کیا، بعض نے یہاں تک کہا کہ ریلوے کو تجارتی نقطہ نظر سے بہت ہی سودمند اور نفع بخش ثابت کرنے کے لیے تمام ریلوے کی لاگت بھی ”قرضہ عامہ“ میں منتقل کر لی جائے تاکہ ریلوے کو کچھ سود ہی ادا نہ کرنا پڑے! اس طرح ریلوے کی نفع بخش نوعیت اور زیادہ بڑھ جائے گی۔

ایک اور نقاد نے کہا کہ ریلوے ممبر کی تجویز واقعی بہت خوب ہو سر و بازاری

کچھ چھ سات سات سالہ دور میں جو ریلوں پر اجتماعی نقصان ہو یا ریلوں کی بڑھی فضول خرچی اور شاہی تنخواہوں کی وجہ سے جو بار پڑے اُسے قومی قرضے میں محسوب کر لیا جائے اور ریلوں کو سبک دوش کر دیا جائے البتہ جب تجارتی گرم بازاری رہے اور ریلوں کو منافع وصول ہوتا ہے تو خالص منافع کے ایک جزو کو بطور تبرک وصول کر کے ریلوں کا احسان مانا جائے، ان کی تعریفیں کی جائیں اور ان کی نفع بخشی کے گیت گائے جائیں۔

غرض مختلف قسم کی نکتہ چینیاں کی گئیں پھر بھی ہندستان کی مرکزی قانون ساز مجلس میں باقاعدہ طور پر یہ تجویز کی گئی کہ تمام گزشتہ ذمہ داریوں کو ایک مشت قلم انداز کر دیا جائے۔ قانونیہ کے ارکان اور قومی رہبروں وغیرہ کے ہنگاموں سے یہ تجویز تو مسترد ہو گئی مگر سرکاری اثرات کو کام میں لا کر ایک اور تجویز منظور کرائی گئی کہ کم سے کم تین سال تک ریلوں کا پیش کش ملتوی رکھا جائے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ محض ملتوی کرنے سے نہ تو زیر باری کم ہوتی ہو اور نہ نفع بڑھتا ہو۔ ۶۶ کروڑ کی رقمی زیر باری سے سبک دوش ہونا کوئی کھیل نہیں۔ کسی ذمہ دار افراد سمجھتے ہیں کہ کسی معلومہ مدت میں ریلوں کے لیے یہ ”قطعاً ناممکن“ ہوگا کہ وہ آئندہ منافعوں سے گزشتہ خساروں کی تلافی کر سکیں۔ واقف کاروں کا اندازہ ہے کہ ایک نسل تک بھی ریلیں اس بار کو اتار نہیں سکیں گی غرض خالص ”تجارتی نقطہ نظر“ سے ریلوں کی موجودہ ذلوں حالی اس درجہ خراب ہو کہ سولے انقلابی اصلاح کے اور کوئی چیز ریلوں کی مالی حالت کو نہیں سدھار سکتی۔

یہ اذہن ضروری ہے کہ ریلیں اپنے اخراجات میں کمی کریں یہ کمی اُسی وقت ممکن ہوگی جب کہ ضرورت سے زیادہ تنخواہیں پانے والوں کی تعداد گھٹائی جائے یعنی ان عہدہ داروں کی تعداد میں تخفیف کی جائے جو اپنی قابلیت، افادیت اور

کارگزاری کے بالکل غیر متناسب معاوضے پارہے ہیں یہ اور بھی ضروری ہے کہ ہزاروں سے زیادہ تنخواہ پانے والوں کے بچتے ایک لخت موقوف کر دیے جائیں اور متوسط تنخواہ والوں کے بچتے بھی کم کیے جائیں۔

ہندوستانیوں کو عرصے سے گلہ ہے کہ ریلوے عہدہ دار ریلوے کی ملازمتوں میں سب سے زیادہ خیال یورپینیوں اور ان کے بعد ہندوستانی نژاد گوروں کا کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کے حقوق کا خاطر خواہ لحاظ نہیں کیا جاتا۔ یہ شکایت بالکل بجا ہے۔ ہماری ریلیں اب تک نہ صرف ملازمتوں بلکہ گتوں اور ٹھیکوں کو دیتے وقت، نسل و رنگ، قومیت اور مذہب کا لحاظ کرتی ہیں۔ سب سے زیادہ انگریزوں پر عنایت ہوتی ہے، دیگر یورپینیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے، اینگلو انڈین افراد کی حالت بھی اچھی ہے ان کے بعد ہندوستانیوں کا نمبر آتا ہے، اور ان میں بھی مختلف طریقوں پر امتیاز کیا جاتا ہے، گندمی اور کالے ہندوستانیوں میں فرق کرنے کے علاوہ فرقہ داری اصول بھی کارفرما ہے مثلاً یہ عام سکایت ہے کہ ہماری ریلیں مذہب داری امتیاز کے بہت ہی غیر متناسب طریقے پر بعض فرقوں پر عتاب اور بعض پر عنایت کرتی ہیں۔ زبانی اور تحریری نکتہ چینوں سے مجبور ہو کر چند سال سے حکومت نے ملت داری مطالبوں کو ملحوظ رکھنا شروع کیا ہے مگر اب بھی ہندوستانیوں کے حقوق بہت نظر انداز کیے جاتے ہیں اور تقریباً طلب جاہلادوں کو بھرتے وقت یا چھوٹے بڑے گتوں اور ٹھیکوں کی تقسیم کے موقع پر فرقہ داری روح کارفرما رہتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فرض شناسی، فنی واقفیت، اور اعلیٰ کارکردگی کے نقطہ نظر سے ہندوستانیوں میں اب بھی بہت کسر باقی ہے، مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ہندوستانیوں میں ذمہ داری کا احساس مفقود ہے، فرض شناسی معدوم ہے اور فنی قابلیت

عقفا ہو، جدید ترین اعداد سے پتہ چلتا ہو کہ تمام بڑے بڑے اور متوسطہ عہدوں کی مجموعی تعداد (صرف قسم اول کی ریلوں میں) ۱۹۳۷ء جس میں سے خالص یوپی میں ۱۸۰۰ اور اینگلو انڈین ۳۳۹۵ ہیں گویا ۱۹۳۷ء میں یورپی یا نسلی یورپی افراد کی تعداد ۵۱۹۵ ہے۔ جب تمام بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز افراد ایک ہی رنگ اور نسل کے ہوں گے تو قدرتی طور پر خالص ہندوستانیوں کو شکایت ہوگی کہ خود انھیں کے ملک میں ان کے حقوق کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ یہ بھی عجیب بات ہو کہ قسم اول کی ریلوں کی تعداد ظاہر کی گئی اور دوسری قسم اور تیسری قسم کی ریلوں میں عہدوں کی تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ یہ معلوم اس میں بھی کوئی مصلحت ہو یا محض اتفاق ہے۔

غرض ہندوستانی ریلوں میں ”ہتھنڈ“ (یعنی ہندوستانیوں کی زیادہ تعداد میں بھرتی کر کے ریلوے کو ہندوستانی بنانا) ایک اہم مسئلہ ہی۔ اسی طرح ملازمت کے تمام درجوں میں تمام فرقوں کی معقول نیابت کا مسئلہ ایسا نہیں جسے نظر انداز کیا جاسکتا ہو۔

حال ہی میں سرانڈو کوٹھونے سالانہ ریلوے کانفرنس کی صدارتی تقریر میں کہا:۔

۱۷۔ قسم اول کی ریلوں سے مراد پچاس لاکھ سے زیادہ سالانہ آمدنی حاصل کرنے والی ریلیں ہیں۔
۱۸۔ ہندوستانی ریلوں کے مسئلے کی پیچیدگی پہلی قسم، دوسری قسم اور تیسری قسم کی تفویض کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے۔ پہلی قسم کی ریلوں سے وہ ریلیں مراد ہیں جن کی سالانہ خام آمدنی ۵۰ لاکھ سے زیادہ ہے۔ دوسری قسم اور تیسری قسم کی ریلوں کی تفویض بھی آمدنی پر مبنی ہے۔ یعنی دنل لاکھ سے پچاس لاکھ تک سالانہ آمدنی کی ریلیں دوسری قسم کی اور دنل لاکھ سے کم تیسری قسم کی قرار دی گئی ہیں۔

“The grant of promotion on the basis of neither of experience nor efficiency but of community would be a disastrous step. It would mean that where seniority is the normal rule, a senior might find a junior promoted over him merely because he belonged to another community and where selection is the principle the most deserving would find that a less competent was preferred.”

”ترقیوں نہ تو تجربہ کاری اور کارکردگی بلکہ فرقہ داری اصول کی بنا پر دینا سب سے اہم ہو گا۔ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ جہاں عام طور پر سنیاری کی بنا پر ترقی دی جاتی ہو، ایک سینیئر دیکھے گا کہ ایک جونیئر کو اس پر ترجیح محض اس وجہ سے دی گئی کہ وہ کسی اور فرقے سے متعلق ہو اور جہاں انتخاب کا اصول کارسرا ہو وہاں سب سے زیادہ مستحق آدمی کے ہوتے ایک کم کار گزراہ شخص کو ترجیح دی جائے گی۔“

بحث مباحثے کے طور پر سرانڈرو کے قول میں بظاہر صداقت ہو اور اس کو بخوبی واضح کیا جاسکتا ہو مگر علی اعتبار سے اوجھتی طور پر ان کا یہ استدلال اس وجہ سے صحیح نہیں کیونکہ سنیاری کا اصول فی نفسہ قابل ستائش نہیں کسی شخص کو سنیاری کی بنا پر ترقی دینا ہولت کے اعتبار سے مفید ہو تو ہو مگر کارکردگی اور کارکردگی کے نقطہ نظر سے سنیاری کے اصول کو نظر انداز کرنا بڑا ناہوشیاری اور کارکردگی نہ تو لازم و ملزوم ہیں اور نہ سنیاری بڑے بڑے عہدوں اور ذمہ داران ملازمتوں کے موقع پر ایک مسلمہ اصول ہو۔ رہا کارکردگی کا سوال جس کی خاطر سرانڈرو فرقہ داری نیابت کے مسئلہ کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔ ہندستان جیسے وسیع ملک کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ ایک مضحکہ خیز بات ہو کہ دیوے عہدہ داروں کو نصف کروڑ سکھوں میں یا ہ کروڑ مسلمانوں میں اتنے

کار گزار لوگ ہی نہیں ملتے کہ وہ ریلوے کی معقول خدمت کر سکیں۔

قدرت اپنی فیاضی میں فرتے اور درجے اترتے اور نسل، قوم اور مذہب کا خیال نہیں رکھتی۔ ہر قوم و ملت، مذہب و فرقہ کے لوگوں میں ہمہ قسم کی قابلیتیں ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ محکومیت اور حاکمیت، ملکیت اور غلامی کی وجہ سے بعض لوگوں کو تعلیم کا زیادہ موقع ملتا ہے اور دوسرے اس قسم کی تعلیم اور تجربے سے محروم رکھے جاتے ہیں لہذا ریلوں سے ہندوستانیوں کی یہ شکایت بالکل بجا ہے کہ وہ اعلیٰ خدمتوں پر ضرورت سے بہت زیادہ یورپی نسل کے افراد کا انتخاب کرتی ہیں اور ہندوستانیوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

ہندستان میں مختلف مذہب و ایمان، رنگ و روپ اور نسل کے افراد آباد ہیں۔ سبھی سے ریلوں کی آمدنی وصول ہوتی ہے، سبھی ریلوں میں سفر کرتے ہیں لہذا ریلوں کی ملازمتوں کی تقسیم بھی اس طرح ہونی چاہیے کہ کسی فرقے یا جماعت یا صوبے یا نسل کے لوگوں کو بجا شکایت نہ ہو۔ فرقہ داری اصول کو اختیار کرنے سے سرانجام کو خوف ہے کہ سینیارٹی اور تجربہ کاری کے اصولوں کی تخریب ہوگی۔ ہندوستانیوں کا خیال ہے کہ چند حق تلفیاں ہوں بھی تو کوئی ہرج نہیں، کیونکہ اس اصول کو اختیار کرنے سے ناکارہ، قریب پنشن، مردہ دل سینیروں پر نسبتاً کم عموالوں کو ترتی ملے گی اور کم عموالے افراد عام طور پر زیادہ جاندار ہوتے ہیں؛ انھیں کسی اور خیال سے نہ ہرے اس لیے بھی زیادہ محنت کرنی پڑے گی تاکہ ان کے انتخاب سے بڑا اثر نہ پڑے نیز ”تجربہ کاری اور کارگزاری“ اضافی اوصاف ہیں۔ دیکھنے میں تو یہ بہت عمدہ اصول ہیں مگر حقیقت میں ان کی آڑ میں کہیں کنبہ پروری اور دوست نوازی ہوتی ہے اور کہیں نسلی برتری کے غرور میں اپنے ہم نسل اور ہم رنگ لوگوں کو سہا جاتا ہے۔ ہماری زبان کی ایک مشہور کہاوت ہے ”مالو تو دیوی نہیں تو پتھر“ ترقیوں

کے وقت زیادہ تر یہی ہوتا ہے ”مانو تو کار گزار نہیں تو نکھٹو“ اگر سیناریٹ اور ”تجربہ“ کو نظر انداز کر کے فرقہ داری اصول پر لوگوں کو ترقیات دی جائیں تو چند دنوں میں معلوم ہو جائے گا کہ وہی لوگ جو ناقدریوں کی وجہ سے معمولی خدمتوں پر پڑے تھے بہت کار گزار ثابت ہوئے۔ لوگوں کی مخفی قابلیتیں ظہور میں آئیں گی اور دو چار مرتبہ اگر حقیقی طور پر حق تلفی ہوگی تو کئی مرتبہ حیرت انگیز انکشاف ہوگا۔ غرض فرقہ داری اصول کو اختیار کرنے میں جس قدر خطرہ ہے اسی قدر فائدے کا امکان ہے۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں یورپی افسروں اور یورپی نسل کے افراد پر جو بہت ہی غیر متناسب عنایتیں ہوتی ہیں وہ ختم ہو جائیں گی اور ہندوستانیوں کو اپنی کارگزاری ثابت کرنے کا موقع ملے گا۔ علم و فضل، مہارت و کمال، ہنر اور کارگزاری کسی نسل یا مذہب کی ملک نہیں۔ لوگوں کو تعلیم اور تھیں پنے کا موقع دیجئے تو ہر مذہب و نسل فرقہ و قوم میں کارگزاری، قابلیت، علم، کمال، ظہور میں آتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریلوے کی خدمتوں کا ٹھیکہ یورپینوں کو دیا گیا ہے اور وہ اپنے نسل اینگلو انڈینوں اور ہم مذہب عیسائیوں پر کارگزاری اور سیناریٹ کی آڑ میں مہربانیاں کرتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو اب بخوبی معلوم ہو گیا کہ یہ دونوں نام ہندو اصول و حقیقت پبلک کی گمراہی کے لیے اختیار کیے گئے ہیں۔ ہندوستانیوں کے لیے یہ تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ دوسری قوم و نسل کے افراد کو قدرت نے قابلیت کا اجارہ دے رکھا ہے۔ اسی لیے ان کا مطالبہ ہے اور بالکل واجبی مطالبہ ہے کہ ریلوے کی خدمتوں کو ”ہندیانا“ چاہیے یعنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہندوستانیوں کو مختلف خدمتوں پر مامور کرنا چاہیے۔ جا بجا مختلف صوبوں اور حصوں میں ریلوے مدارس اور ریلوے کالج قائم کئے جانے چاہئیں تاکہ ہندوستانیوں کو ریلوے کے کام

سے بخوبی واقف ہونے کا موقع ملے اور چند سال میں واقف کاروں کی اتنی تعداد
ہمیتا ہو سکے جو ریلوے کی ہر خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔ لوگوں کو تعلیم
اور تفصیل ہنر سے محروم رکھنا اور ان پر غیر کارگزاری اور ناجوہ کاری کا الزام لگانا
نا انصافی کرنا اور اُلٹا اہتمام لگانا ہے۔



پانچواں باب

ہمارے ہوائی رستے

انسان کے لیے زمین اور پانی کا ماسہ طو کرنے کے لیے اپنی ذات سے مدد لینا ممکن تھا مگر اڑنے کے لیے اس کا امکان نہ تھا، اس کے پر نہ تھے اور بے پری نے اسے مجبور کر رکھا تھا لہذا وہ بیٹھا بیٹھا حسرت و شوق سے چڑھیلوں اور پرندوں کو دیکھا کرتا تھا یا ”اڑن کھٹولے“ اور ”اڑتی ہوی قالین“ کی کہانیاں سن سنا کر اپنا دل بہلاتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ کاش جس وہ بھی اڑ سکتا! اور اس میں شاہین کی سی طاقت اور جیل کی سی سبک پیری ہوتی! اسی حسرت و اربابان میں صدیاں بیت گئیں، انسان نے ہر شعبہ زندگی میں ترقی کی، بہترین سے بہترین سواریاں وجود میں آئیں، بڑے بڑے خوشنما، پر تکلف اور محل نما جہاز بنے، ان پر عیش و راحت کے سامان بھم پہنچائے گئے مگر پرواز کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔

کہیں پندرہویں صدی میں جا کر غباروں کے ذریعے اڑنا ممکن ہوا مگر استوں کو طو کرنا تو بڑی بات ہے، سیر و تفریح کے لیے بھی غبارے موزوں نہ ہو سکے اور یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہی کہ پانی اور زمین کی طرح ہوا پر بھی سیر کرنا ممکن بلکہ آسان اور اطمینان بخش بھی ہو۔ کھول کی ایجاد، میکینٹ کی ترقی، و خالی جہازوں کی کامیابی اور ریلوں کی ترقی نے رہ رہ کر اس خیال کو تازہ کیا جس طرح ہو اڑنا سیکھا جائے انیسویں صدی کے آخر تک مغرب والوں کی صنعتی قابلیت، فنی ہمت

اور میکانی صلاحیت اس کمال تک پہنچ چکی تھی کہ پرداز کا خیال دماغوں میں جاگنیا ہو گیا تھا اور مختلف قسم کے افراد، نسلی اور سنجیدہ، ماہر اور عامی، کوشش کر رہے تھے کہ کوئی ایسا طیارہ بنائیں کہ جس سے آسمان کی سیر ہو سکے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے باضابطہ طور پر تجربے ہونے لگے، ساہا سال انسان اور قدرت میں کشمکش جاری رہی، عین اُس وقت جبکہ انسان کو اپنی کامیابی کی پوری امید ہو گئی تھی کچھ ایسی بات پیدا ہوئی جس کی وجہ سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ ان موجدوں کی سوانح حیات دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت ان سے دل لگی کر رہی ہو کبھی کبھی اچھی امیدیں پیدا کرتی ہو اور کبھی عین وقت پر چکھا دے جاتی ہو۔ یہ موجد ساہا سال تحقیق و تجربے کر کے اپنی زندگی کے بہترین سال مجوزہ ایجاد کو کامیاب بنانے کے لیے صرف کر کے بار بار ناکام ہوتے تھے اور نہ صرف مالی نقصان بلکہ طعن و تعریض کے زخم برداشت کرتے تھے۔ ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مالی نقصان گوارا کرنے اور صحت کو قربان کرنے کے بعد عوام کے مستحضر سے کس قدر سخت مایوسی اور تلخی پیدا ہوتی ہو مگر آفریں ہو ان موجدوں کے جو صلے پر کہ وہ اپنی دُھن میں ثابت قدم رہ کر ایک ظاہر ناکام ایجاد کو کامیاب کر دکھاتے ہیں۔ چنانچہ ہوائی جہازوں اور طیاروں کی ایجاد اور رواج میں یہی ہوا۔ بار بار ناکامیاں ہوئیں، بار بار مالی نقصان ہوا، بار بار موجدوں پر مصیبت آئی مگر ہمیشہ وہی کامیاب ہوئے جو اہل ارادہ رکھتے تھے کہ چاہے کچھ ہو اپنے تجربوں کو کامیاب بنائیں گے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی سینیں میں یورپ اور امریکہ میں پرداز کی باضابطہ کوششیں شروع ہوئیں، سب سے پہلے رائٹ نامی دو امریکی بھائیوں کو کامیابی ہوئی ۱۹۰۳ء میں ایک فرانسیسی نے فرانس اور انگلستان کے درمیان ہوائی رشتہ قائم کیا۔ اسی اثنا میں جرمنی کے مشہور امیر کاؤنٹ زپلن نے بڑے عبارے

بنائے اور ابتدائی کوششوں کے بعد اتنی کامیابی حاصل کی کہ اُسے سرکاری سرپرستی اور قومی امداد نصیب ہوئی۔ چند سال بعد جنگ عظیم شروع ہوئی جس کی وجہ سے طیاروں اور ہوائی جہازوں کے بنانے پر خاص طور پر توجہ کی گئی، جنگ سے پہلے ہی لوگوں نے محسوس کر لیا تھا کہ بنی نوع انسان کا یہ پاکار نامہ بھی صرف تہذیب و تمدن پھیلانے کا ذریعہ نہیں ہوگا بلکہ اس سے غارتگری اور تباہی، مصیبت اور تکلیف پھیلانے کا کام بھی لیا جائے گا۔ چنانچہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی جنگ کے اہر اور فوجی محکمے طیاروں پر مہربان ہو گئے، جنگ شروع ہونے کے بعد اور جنگ کے دوران میں فوجی ضرورتوں کے تحت ان کی تعمیر بہت توجہ کی گئی اور نہ صرف جاسوسی اور خبر رسانی، بلکہ بم باری کے لیے ان طیاروں اور ہوائی جہازوں کو استعمال کیا گیا، آگ برسانا محاورہ نہیں رہا حقیقت ہو گئی۔ اسی طرح "ہوائی مُعلق ہونا" "ہوا پر سیر کرنا" جھوٹی باتیں نہیں رہیں کیونکہ اور تو اور محکمہ ہوائیات وجود میں آیا! جنگ کے بعد طیاروں اور ہوائی جہازوں کو تہذیب و تجارت کی سچی خدمت نصیب ہوئی۔ سب سے پہلے ایک انگریز نے امریکہ سے آئرستان تک پرواز کر کے بحر اوقیانوس کو بالا بالا ہی طح کر لیا، کسی جواں مردوں نے اس کی تقلید کی۔ بعض عورتوں کو بھی کامیابی نصیب ہوئی۔ سحلولہء میں لنڈ برگ نامی امریکی نے نیویارک سے پیرس تک مسلسل پرواز کی اور اُس کو اتنی شہرت نصیب ہوئی اور امریکی قوم نے اس کی اتنی آؤ بھگت کی کہ لوگوں نے یقین کر لیا کہ بحر اوقیانوس کو سب سے پہلے پرواز کرتے ہوئے عبور کرنے کا ہرا اسی کے سر ہو۔ اسی عرصے میں گران زپلن نامی ہوائی غبارہ جرمنی نے تیار کر کے تادان کی ادائی میں امریکہ کے حوالے کیا اس خوبصورت اور وسیع غبارے کی تیاری کے بعد کئی چھوٹے بڑے زیپلن اور تیار کیے گئے، جرمن قوم نے اپنے لیے "ہنڈن برگ" نامی زپلن تیار کیا، جو

نظاہر ہوائی محل تھا، اس میں سونے کے کمرے، کھانے کا کمرہ، پینے کا پیش دالان اور بہت سے ضروری چھوٹے بڑے کمرے تھے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طویل سفر کے لیے یہ غبارے ہی سب سے زیادہ موزوں ہیں کیونکہ ان جہازوں نے مختلف ملکوں کی سیر کرنے کے علاوہ یورپ و امریکہ میں باضابطہ آمد و رفت قائم کر دی تھی اور بیسیوں مرتبہ نظام نامے اور وقت نامے کے مطابق پرواز کر چکے تھے مگر ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں پُر در پُر کئی حادثے ہوئے انگریزوں کا بنایا ہوا نیا غبارہ R. 101 اپنے اولین سفر پر ہندوستان آنے کے ارادے سے انگلستان سے نکلا مگر فرانس کے مشرقی حصے میں گر کر ڈھیر ہو گیا، ۱۹۳۱ء میں اس سے قبل ہی امریکہ کے دو بڑے ہوائی جہاز تباہ ہو چکے تھے اور وہ اپنی روایتی خصوصیت کے خلاف ہمت ہار بیٹھے تھے، ۱۹۳۲ء میں جرمنی کا مایہ ناز جہاز ہنڈ برگ بھی امریکہ میں شعلوں کے نذر ہو گیا۔ ان ہیمنہ ناکامیوں کے بعد اور ہوائی جہازوں کی تعمیر میں کثیر مصارف کی وجہ سے اور ان کو اڑانے اتارنے اور رکھنے کے لیے وسیع انتظامات سے تنگ آ کر لوگوں نے اس قسم کے جہاز بنانے ہی چھوڑ دیے اور اپنی تمام تر توجہ زمینی اور سمندری طیاروں پر مہذول کی، جنگ کے بعد ہی تمام بڑے بڑے یورپی شہروں کے درمیان ہوائی آمد و رفت اور نقل و حمل قائم ہو چکی تھی اور بہت وسیع، پر تکلف اور آرام دہ طیارے بننے لگے تھے۔ امریکہ میں دولت اور میکانیکی ترقی کی وجہ سے ہوائی سفر کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ امریکہ کے وسیع براعظم کو طر کرنے کے لیے اسی طرح وقت مقررہ پر نکلتے اور آتے تھے جس طرح ہمارے ہاں ریلیں آتی جاتی ہیں ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ یورپ اور ایشیا کے درمیان ہوائی سفر شروع ہوا اور ہالینڈ سے جاوا تک یا انگلستان سے ہندوستان

اور برآمد اور اسٹریٹیا تک ہوائی ڈاک اور ہوائی آمد و رفت قائم کی گئی پر رواز کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے مد نظر بتدریج ترنیاں کی گئیں اور غیر ملکوں کی نسل ڈاک طیاروں کے ذریعہ بھیجی جانے لگی مسافروں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر طیاروں کی تعداد بڑھائی گئی چنانچہ موجودہ جنگ کے آغاز تک یہ صورت پیدا ہو گئی تھی کہ روزانہ کئی کئی جہاز آتے جاتے تھے اور بین الاقوامی ہوائی سفر کے لیے کراچی جو دھپور، دہلی، الہ آباد اور کلکتہ میں موزوں ہوائی میدان، اقامت خانے تیار کیے گئے اور ضروری اشیاء فراہم کی گئیں۔

نہ صرف بین الاقوامی سفر اور نقل و حرکت میں سہولت پیدا کرنے کے لیے ہندستان میں انتظام و اہتمام کیا گیا بلکہ خود ہندستان کے مختلف صوبوں اور بڑے شہروں میں آمد و رفت کی سہولت پیدا کرنے کی خاطر بھی موقع محل کے لحاظ سے اور زمانے کی ضرورت اور تجربوں کی کامیابی کے مطابق ہوائی سروس قائم کی گئی چنانچہ ہمارے ملک میں سب سے پہلے پارسیوں کی مشہور ایما کمپنی نے حکومت ہند کی سرپرستی اور انھیں کی امداد سے کراچی، اور بمبئی اور بمبئی اور مدراس کے درمیان سروس قائم کی، جس سے نہ صرف مسافروں کی آمد و رفت کے لیے ایک نیا ذریعہ پیدا ہوا بلکہ ڈاک کو زائد خرچ اور کرنے کے بعد جلد تر بھیجنے کا امکان بھی ہوا۔

جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ہوائی آمد و رفت کے باضابطہ ذریعوں کا جال وسیع اور گنجان ہوتا گیا۔ ہر سال کوئی نہ کوئی سروس شروع ہوئی۔ مقامی اور موسمی ضرورتوں کے لحاظ سے اس میں کمی بیشی ہوتی رہی بہر حال مسئلہ کے شروع ہی میں کراچی سے بمبئی، بمبئی سے حیدر آباد، حیدر آباد سے مدراس، مدراس سے کولمبو، یا بمبئی سے دہلی، دہلی سے جو دھپور ہوتے ہوئے کراچی یا الہ آباد ہوتے ہوئے کلکتہ

آنے جانے کے لیے باقاعدہ انتظام ہو گیا۔ اگرچہ موجودہ جنگ کی وجہ سے بین الاقوامی ہوائی سروس موقوف ہو گئی اور اندرون ہند بھی کفایت اور تحدید کرنی پڑی مگر اب بھی ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہوائی آمد و رفت قائم ہو مسافراتے جاتے ہیں اور زاید خرچ ادا کرنے والے ہوائی ڈاک کے ذریعے مراسلت کرتے ہیں، خاص خاص موقعوں پر جلد آنے جانے کے خواہش مند مال داروں اور بڑے بڑے عہدہ داروں کے لیے یہ امکان ہو کہ خصوصی طیارہ یا ہوائی ٹیکسوں کے ذریعے اپنے حسرت و ارمان پورا کریں اور قیمت ادا کر کے اپنا ”قیمتی“ وقت بچائیں!

یہ ہو مختصر سرگزشت ”ہمارے“ طیاروں اور ہوائی سفر کی! مگر سب سے زیادہ صحیح بات تو یہ ہو کہ ہمارے وطن میں اڑنے والے طیارے ہمارے نہیں!! نہ ہم طیارے بنا سکتے ہیں، نہ ہیں طیاروں کے بنانے یا کارخانے قائم کرنے کا موقع ہو، جنگ کے طفیل سے جو کارخانے بنگلور میں قائم ہو، اس میں بھی پر دیسی عنصر غالب ہو۔ زیادہ تر غیر مالک میں بنے ہوئے طیارے غیروں ہی کے فائدے اور سہولت کے لیے ہمارے ملک میں اڑتے پھرتے ہیں۔ ”ہماری“ کمپنی میں بھی سرمایہ بہت کچھ غیروں کا ہو اور عمل دخل تو براہ راست یا بالواسطہ ان کا ہو ہی چاہیے۔ لہذا سچی بات تو یہ ہو کہ جس طرح چھکڑے اور ہیلیاں ہماری ہیں، اس طرح نہ تو طیارے ہمارے ہیں نہ ریلیں ہماری ہیں! ملک اور نام ہمارا ہو کام اور فائدہ غیروں کا ہی!!۔

چھٹا باب

جدید ذرائع نقل و حمل کی اہمیت

”ہماری ریلیں اور سڑکیں“ اس کتاب کا موضوع ہے مگر یہ ظاہر کرنا مشکل ہے کہ صرف ریلوں کی وجہ سے ہماری تمدنی زندگی پر کیا اثرات پڑے۔ ہماری زندگی پر جو اثرات پڑے ہیں وہ زیادہ آسانی اور زیادہ صحت کے ساتھ اس وقت ظاہر کیے جاسکتے ہیں جب کہ تمام جدید ذرائع آمد و رفت اور نقل و حمل اور خبر رسانی کو ملحوظ رکھا جائے۔ اسی لیے ہم نے اس باب کا عنوان اختصار کی خاطر جدید ذرائع نقل و حمل کی اہمیت رکھا ہے اور ان سے مراد نہ صرف ریلیں، دفائی جہاز اور ہوائی جہاز ہی بلکہ تار برقی اور ریڈیو وغیرہ بھی۔

سیاسی استحکام اور سیاسی تنظیم

جدید ذرائع خبر رسانی اور نقل و پزیری کے نمایاں اثرات میں سیاسی استحکام اور سیاسی تنظیم بہت اہم ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اگر برقی تار، دفائی جہاز، اور ریلیں نہ ہوتیں تو نہ سلطنت برطانیہ جیسی وسیع اور منتشر سلطنت وجود میں آتی، اور نہ متحدہ ریاستوں کا وسیع سے وسیع تر ہونا اور مستحکم ہوتے جانا ممکن ہوتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ عہد قدیم اور قرون وسطیٰ میں جب کبھی بڑی بڑی سلطنتیں وجود میں آئیں تو وہ زیادہ تر غیر معمولی افراد کے کارناموں کا نتیجہ تھیں اور ان کے گزر جانے کے

ان کے جانشینوں کے لیے یہ بالکل نامکن تھا کہ وہ اتنے وسیع ملکوں کو سنبھال سکیں۔ اسکندر اعظم کی فتوحات ایک زترین اور یادگار کارنامہ تھیں مگر اسکندر اعظم کی قائم کردہ سلطنت اس کے بانی کے انتقال کے بعد ہی کئی چھٹی بڑی ریاستوں میں منقسم ہو گئی، یہی حال چینیز خاں کی فتوحات کا ہوا، جب بابر کے جانشینوں نے ہندستان میں مستقل طور پر رہنا پسند شروع کیا تو ان کے ہاتھ سے ان کا اہلی وطن جاتنا رہا سارا ہندستان پر قبضہ کرنا اور اسے صدیوں اپنے اقتدار میں رکھنا اُس زمانے کی مشکلات کی وجہ سے نامکن تھا۔

نہ تو شورشوں کی اطلاع موجودہ زمانے کی طرح منٹوں اور گھنٹوں میں صدر مرکز تک پہنچ سکتی تھیں اور نہ فوجوں کی نقل و حرکت موجودہ زمانے کی طرح دنوں اور ہفتوں کی بات تھی۔ سچ پوچھیے تو یہ برقی تار اور ریلوں کا کارنامہ ہے کہ ان کی وجہ سے سیاسی دنیا میں کایا پلٹ ہوئی اور یہ بات ممکن ہوئی کہ بڑی بڑی سلطنتوں کو نہ صرف سنبھالا جاسکے بلکہ انھیں مرکزیت سے وابستہ رکھا جائے۔

مثلاً امریکہ کی متحدہ ریاستوں کو لیجئے۔ ان کا رقبہ ہندستان سے دو گنا ہے اور مشرقی ساحل سے مغربی ساحل تک تین ہزار میل اور شمالی سرحد سے جنوبی سرحد تک دو ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ سارے ملک کا انتظام ایک شہر میں قیام کرنے والی صدر حکومت کے ذریعے ہوتا ہے، قانون ساز مجلس، معتمد، وزیر اور صدر جمہوریہ سب ایک ہی جگہ نہ بھی ہوں تو شدید ضرورت کے وقت فوراً طلب کیے جاسکتے ہیں اور ان کا راج دھانی میں پہنچ کر فیصلے کرنا یا رائے مشورہ دے سکرنا زیادہ سے زیادہ دو ایک دن کی بات ہے، فوری ضرورت ہو تو برقی تار یا ٹیلیفون کے ذریعے رائے شناسی ہو سکتی ہے، کہیں ہنگامہ برپا ہو چکا ہو یا کسی مقامی عہدہ دار کو ہدایت کی ضرورت ہو تو پڑوسی ریاستوں سے امداد اور صدر جمہوریہ مقامی حکومت

سے مشورہ طلب کر سکتا ہو اور نسبتاً تھوڑے عرصے میں ملک پہنچ سکتی ہو۔
یہی حال ہندستان کا ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں مالیبار میں بغاوت ہوئی تھی سارے
ملک کے مختلف فوجی اڈوں سے ملک بھیجی گئی، سنگاپور اور قاہرہ، ہانگ کانگ
اور مالٹا کے فوجی دستے اور جہازی بیڑوں کو تیاری کی ہدایت تھی۔ جب کبھی مقامی
افسر یا کماندار کو کسی مشورے یا ہدایت کی ضرورت ہوتی تھی تو صدر دفتر جنگ سے
یا گورنر یا وائسرائے سے مشورہ کر لیا جاتا تھا۔ انھیں بھی جب کبھی تذبذب ہوتا تو
وہ سلطنت کے اعلیٰ حکام سے پوچھتا کہ کام کرتے۔ یہی حال ۱۸۵۷ء میں برما
کے غدر کا ہوا۔ بغاوت کو شروع ہوئے چند گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ لندن اور
دہلی کے باہمی مشورے سے ہندستان کے فوجی دستے روانہ کرنے کا فیصلہ
کر لیا گیا اور وہ ہفتوں کے اندر بریسوں کو ہندوستانیوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔
مزید مثالیں دینا بیسود ہو جس قدر زیادہ جدید سیاسی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے
اسی قدر زیادہ جدید ذرائع خبر سانی اور نقل پزیری کی اہمیت واضح ہوتی ہو اور یہ اندازہ ہو سکتا
ہو کہ سلطنتوں کو بگاڑنے اور سنوارنے میں میکانی ماحول کو کس قدر دخل ہو۔ ظاہر ہو کہ تمام تر
یا زیادہ تریکانی ماحول کی وجہ سے سلطنتوں کی قسمت نہیں بدلتی، ممبروں کی سیاست کاری،
رہنماؤں کی دانشمندی، قوم کی مختلف جماعتوں کی یاشار پسندی، جفاکشی، ہنرمندی
اور فوجوں کی بہادری اور زندہ دلی بہر حال ضروری ہیں۔ ان غیر میکانی عضروں
کی اہمیت کو نظر انداز کرنا مقصود نہیں، صرف یہ ظاہر کرنا ہو کہ ریلیں نہ ہوتیں تو
عاقلوں، مدبروں اور فرماں رواؤں کی ساری عقلیں دھری رہتیں، اور وسیع سلطنتیں
منقسم ہو جاتیں، آئے دن کے ہنگاموں، شو رشو، فسادوں اور بغاوتوں کی
وجہ سے چند سالوں کے لیے بھی کسی حاکم کو چین نصیب نہ ہوتا، غرض سیاسی
تنظیم کو بلند تر اور قابل قدر معیار تک پہنچانا اسی وقت ممکن ہوا جب کہ تاروں

اور ریلوں کی وجہ سے روزانہ ملک کے گوشے گوشے سے خبریں آنی شروع ہو گئیں اور افسروں، عہدہ داروں کی نیز پولیس اور فوج کی نقل و حرکت اس قدر تیز اور آسان ہو گئی کہ بڑے بڑے شہر پسندوں کے دانت کھٹے ہونے لگے۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہو کہ جدید ذرائع خبر رسانی اور نقل و پزیری کی بدولت نہ صرف سیاسی استحکام ممکن ہوا بلکہ سیاسی تنظیم کا میار بلند تر ہو سکا۔

قومیت کا فروغ اور کل ہند تحریکیں | فلسفہ تاریخ کے محققوں نے اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ سیاسی تمدن اور فلسفہ تاریخ کے نقطہ نظر سے جدید زمانے کی ایک نمایاں خصوصیت قومیت کا فروغ ہے۔ قومیت کے تخیل کو انیسویں صدی میں جو کامیابی نصیب ہوئی تھی وہی ایشیائی ملکوں میں اُسے بیسویں صدی میں حاصل ہو رہی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت متعدد جرمنی ریاستوں کا ”جرمنی“ میں اور کئی اطالوی ریاستوں کا ”اطالیہ“ میں متحد ہونا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے اس تحریک کو سارے عالم میں مقبولیت حاصل ہوئی اور لازمی طور پر ہندوستان بھی متاثر ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں قومیت کے تخیل اور مسلک کو جو بڑھتی ہوئی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اس کا سبب مغربی تعلیم بھی ہو مگر سرکاری تعلیم سے بدرجہا زیادہ ان سیکڑوں قوم پرست اور مدبروں کا ہاتھ ہے جنہوں نے ہندوستان میں قومیت کا خیال پیدا کیا، اس کو تقویت بخشی اور اس قدر فروغ دیا اور دے رہے ہیں کہ وہ اب ناقابل انکار حقیقت بن گئی ہے۔

راجہ رام موہن رائے اور سر سید احمد خاں، گوکھلے اور ملک، سر سالار جنگ اور محسن الملک کی طرح بیسیوں معروف اور کم معروف، نام دار اور گمنام ہستیوں

نے گزشتہ زمانے میں قومیت کے تخیل کو پھیلایا، یاگل ہند پیمانے پر اہم تمدنی تحریکیں جاری کیں۔ انھیں کے جانشین اور قائم مقام جہاتما گاندھی اور مالوی جی، ابوالکلام آزاد اور محمد علی جناح، مختلف نوعیتوں کی اصلاحی، قومی، اور سیاسی تحریکیں پھیلارہے ہیں۔ کیا کوئی اس بات سے انکار کر سکتا ہو کہ اگر ہمارے ملک میں جدید ذرائع خبر رسانی اور آمد و رفت نہ ہوتے تو یہ لوگ جو ملک و قوم کی ایسی گراں بہا خدمتیں انجام دے چکے یا دے رہے ہیں اپنی فطری صلاحیتوں سے ملک و قوم کو عشر عشر فیادہ پہنچا سکتے تھے، آپ غور کر کے دیکھیے تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو سہولتیں حاکموں کو سیاسی تنظیم کے برقرار رکھنے میں ریلوں کی وجہ سے حاصل ہو رہی ہیں، اسی قدر ہمارے ملک کی بیسیوں علمی، قومی، اصلاحی اور لسانی تحریکوں کو بھی میسر ہیں جس قدر زیادہ آمد و رفت میں سہولتیں پیدا ہو رہی ہیں سیر و سیاحت کا شوق بڑھ رہا ہو لاکھوں آدمی کاروباری، تعلیمی، اور تفریحی اغراض سے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کر رہے ہیں۔ اسی قدر باہمی واقفیت بڑھ رہی ہو، قومیت کا احساس پھیل رہا ہو۔ ایک ہی علم میں دلچسپی لینے والے یا ایک ہی مقصد اور مسلک سے ہمدردی رکھنے والے بار بار کی ملاقاتوں اور سالانہ اجتماعوں سے اپنے اپنے اغراض اور مقاصد کا پرچار کر رہے ہیں مختلف سمتوں سے اصلاحی تحریکیں شروع ہوتی ہیں، جنھیں (بشرط افادیت و معقولیت) اکثر کل ہند اہمیت حاصل ہو جاتی ہو، مختلف مسلکوں کے دلدادہ اپنے اپنے خیال کا پرچار کرنے کے لیے سارے ملک کا دورہ کرتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح سارے ملک کو اور سارے ملک کو نہ سہی ایک قابل لحاظ تعداد والی جماعت کو فایادہ پہنچاتے ہیں، بیداری کی نشانیاں ہر سمت میں پیدا ہو رہی ہیں۔ اگرچہ مخلص کام کرنے والے دانشمندوں کی تعداد ہر تحریک میں کم ہو مگر انھیں کا دم غنیمت ہی اور ریلوں کے

طفیل ہی سے چند برگزیدہ ہستیاں سارے ملک میں دوڑ دھوپ کر کے تہذیب و شائستگی علم و ہنر، زبان و ادب کو پھیلا کر نہ صرف شمع ترقی کو بجھنے سے بچا رہی ہیں۔ بلکہ اس کے نور میں بھٹوڑا بہت اضافہ کر رہی ہیں۔

اگر ریلیں نہ ہوتیں، اگر وہ خانی جہاز نہ ہوتے، اگر تار برقی اور ٹیلیفون، اخبار اور ریڈیو نہ ہوتے تو نہ قومیت کا تخیل اس قدر فروغ پاسکتا، اور نہ آج کی طرح بیسیوں مفید تحریکیں اتنی اہمیت حاصل کر سکتیں۔ ہندستان کے مختلف طبقوں اور فرقوں کو جگانے میں سب سے بڑا حصہ قومی رہنماؤں کا ہے چونکہ ان کے جد و جہد میں جدید ذرائع آمد و رفت نے بھی سہولت پیدا کی — لہذا ہندستان کی بیداری اور ترقی میں ان وسائل کو بھی شریک سمجھا جائے۔ کانگریس یا مسلم لیگ، ہندو مہاسبھا یا ان سے بھی کم اہم شیعہ کانفرنس، کالیگھٹہ اسوسی ایشن، اگر وال کانفرنس، ہندی ساہیتہ سمیلن یا اردو انجمن، سائنس کانگریس یا میڈیکل کانگریس، معاشی کانفرنس یا فلسفہ کانگریس، غرض کسی نہ کسی قومی، سیاسی، تعلیمی، علمی، سانی، کاروباری یا پیشہ وری جماعت کے سالانہ اجلاس میں شریک ہو کر دیکھیے آپ کو ہندستان کی وحدت یا جماعت کی اہمیت کا احساس ہوگا اور آپ کسی نہ کسی طرح ضرور متاثر ہوں گے، لوگوں سے ملکر آپ نئی باتیں سیکھیں گے، آپ میں نئے نئے ارمان پیدا ہوں گے، آپ کے دل بے بیدار ہوں گے، ممکن ہو کہ آپ میں جذبات بھی پیدا ہوں، موجزن ہوں اور مشتعل ہوں! آپ میں تازگی اور جان داری کی لہر پیدا ہوگی جس سے خدمت پسندی اور صلاحیت ایثار متاثر ہوگی! تا وقتیکہ آپ باطل ”بے حسے“ نہ ہوں آپ ان سالانہ اجتماعوں سے کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ ضرور مستفید ہوں گے، آپ کی نیم خوابیدہ یا مٹھی حسرتیں نمودار ہوں گی اور اس قسم کے اجتماعوں میں شرکت ایک طرح کی روحانی یا قلبی تجدید کا باعث ہوگی۔

اگر ان سالانہ اجتماعوں سے بھی آپ کا قومی یا ملی احساس بیدار نہ ہو سکا یا قومی تحریکوں کے سالانہ جلسوں میں شریک ہو کر بھی آپ کی فرض شناسی تقویت نہ پاسکی تو پھر آپ میں فرض شناسی اور شوق خدمت کا پیدا کرنا اگر ممکن بھی ہو تو محض بخت اور اتفاق سے۔ اس اعتبار سے جدید تمدن کے تمام ذریعوں کو ایک نعمت تصور کرنا پڑے گا۔ اگرچہ ہمارے حاکموں نے یہ نہیں چاہا تھا کہ ان کی بدولت قومیت کو فروغ ہو یا ملت واری تحریکیں کل ہند اہمیت حاصل کر لیں، اگرچہ ہمارے سرداروں کا یہ منشا نہ تھا، کہ ملک و ملت کے ہمدرد مختلف مسلکوں کو پھیلانے میں کامیاب ہوں مگر حقیقت یہ ہو کہ سیکڑوں معروف، ہزاروں غیر معروف اور لاکھوں گم نام بندوں نے طرح طرح سے ملک و ملت کی خدمت کر کے کسی نہ کسی علم و فن، صنعت و حرفت، زبان و ادب، ہنر و کمال کو فائدہ پہنچایا ان ہی کی متحدہ کوششوں سے ہندستان کی تہذیب و شایستگی زندہ ہو، ہنر و کمال کا سرچشمہ سوکھنے نہیں پاتا اور آزادی کی آگ بجھنے نہیں پاتی!

قدامت کا انتشار | تمدنی نقطہ نظر سے جدید ذرائع آمد و رفت اور خبر رسانی کا یہ بھی فائدہ ہو کہ ان کی وجہ سے یا ان کی مدد سے قدامت پرستی اور دقیانوسیت کو پرہیزگیتیں ہوئیں یہ بات تو یقین سے کہی جاسکتی ہو کہ قدامت پرستی اگرچہ مٹی نہیں مگر قدامت کا انتشار شروع ہو چکا ہو۔

ہندستان کی سماجی زندگی میں ایک بہت بڑی نحوست ذات پات کی وہ بے معنی (اور بعض صورتوں میں مضحکہ خیز اور حقارت انگیز) بندشیں ہیں، جن کی مثال بقیہ دنیا میں اور کہیں نہیں نظر آتی۔ ذاتوں کی تفریق نے ہمارے ملک میں اس قدر مصنوعی اہمیت حاصل کر لی ہو کہ شہر اور برہمن کھتری اور ویشی ہی نہیں بلکہ "ویشنو برہمن" اور "ویدک برہمن" "اگر وال" اور "مارواڑی" باوجود نسلی

مذہبی اور اعتقادی یکسانیت کے چند سراسر مصنوعی اور سطحی یا جرمی مامورین اختلاف کی وجہ سے نہ تو ساتھ کھاتے پیتے ہیں اور نہ باہمی رشتے ناتے کرتے ہیں۔ قومی اعتبار سے یہ بڑی بدبختی ہو کہ ہماری آبادی ہزاروں جماعتوں میں منقسم ہو اور ہر جماعت اپنی علیحدگی کو برقرار رکھنے کے لیے پوری کوشش کرتی رہتی ہو۔

شکر ہو کہ مغربیت نے اس جماعت بندی کو توڑنا شروع کر دیا ہو۔ اگرچہ پہلے کے انتظامی عمدہ داروں نے ملک و قوم کی عام فضا سے مجبور ہو کر بڑے بڑے سیشنوں پر ہندو ہوٹل اور مسلم ہوٹلوں کے قیام کی اجازت دی اور ہر اسٹیشن پر ”ہندو“ پانی اور ”مسلم“ پانی کا انتظام کیا مگر شکر ہو کہ اس قسم کی تفریق کو ریلوے کے ڈبوں میں جایز نہ رکھا۔

غنیمت ہو کہ فی الحال اس قسم کا مطالبہ کرنے کی بھی کوئی جرات نہیں کرتا اور چار و ناچار ہندو اور مسلم، پارسی اور عیسائی، شیعہ اور سنی، دہائی اور قادیانی، بہمن اور ہریجن ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں اور کم سے کم سفر کے دوران میں پہلو بہ پہلو بیٹھے راستہ کاٹتے ہیں۔ ان مختلف ذاتوں کے ہم سفر افراد میں تباہ کن خیال ہوتا رہتا ہو، گپ ہوتی ہو

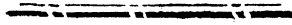
لڑائی ”ٹٹا ہوتا ہو“ اور مجبوری سے ذات بات کے قدیم اصولوں کا ستیا ناس ہوتا ہو۔ مختلف ذاتوں کے لوگوں سے ملنے کے بعد انھیں کبھی نہ کبھی ضرور معلوم ہوتا ہو کہ شرافت اور نیکی، مروت اور رواداری، ہمدردی اور خوش سلوکی کسی قوم اور مذہب فرقہ و ملت، نسل یا ذات کی خصوصی ملکیت نہیں۔ خوش مذاق، ملنسار اور بے غرض افراد ہر فرقے اور مذہب میں پائے جاتے ہیں، انسان کو تجربہ ہوتا ہو کہ اُسی کی ذات کے بعض لوگ بڑے خود غرض، اینٹھو اور مگرے ہوتے ہیں، وہ ریل میں بھی اس طرح سفر کرتے ہیں گویا ریل ان کی جاگیر ہو یا انھوں ہی نے دام دے کر سفر کرنے کا حق حاصل کیا ہو اور دوسرے فالتو بھکاری یا بے ٹکٹ سفر کرنے والے چور ہیں۔

وہ مشاہدہ کرتا ہو کہ بعض لوگ انتہائی غرض مندی سے کام لے کر مسافروں کو داخل ہونے سے روکتے ہیں، گویا ڈبہ ان کا قلعہ ہو! اس کے برعکس وہ بسا اوقات یہ بھی مشاہدہ کرتا ہو کہ بعض مختلف ذات اور مذہب کے لوگ ہر ایک کو مساوی حق دیتے ہیں، کوئی مسافر آجائے تو خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے ہیں، کوئی بڑھا بزرگ ہو تو بلا امتیاز زیادہ آرام سے بیٹھنے اُٹھنے کا موقع دیتے ہیں، کوئی مریض ہو یا تکلیف میں ہو تو خود کھڑے رہتے ہیں اور اُسے لیٹنے کا موقع دیتے ہیں جب انسان ایک ہی ذات والوں میں متضاد خصوصیتیں اور مختلف ذات والوں میں مشترکہ خصوصیتیں پاتا ہو تو وہ لازمی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہو کہ شرافت اور اخلاق کسی مذہب یا قوم کی میراث نہیں، کوئی ذات، کوئی فرقہ، کوئی اصول عمدہ سیرت و نیک کردار کا ضامن نہیں، اچھے اور بُرے ہر مذہب و ملت میں ہوتے ہیں، نیک و بد سبھی ذاتوں میں پائے جاتے ہیں جو زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں وہ یہ بھی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ”ہندو“ پانی اور ”مسلم“ پانی کا فرق سراسر مصنوعی ہو، پانی یا توصاف ہو سکتا ہو یا میلہ پینے کے قابل ہو سکتا ہو یا جراثیم سے بھرا ہوا انسان یا تو شریف ہوتا ہو یا کمینہ، ایمان دار ہوتا ہو یا بے ایمان، بے غرض ہوتا ہو یا خود غرض، صفائی پسند ہوتا ہو یا غلیظ اور گندہ! اس سے زیادہ کافرق، باطنی عقیدوں کا امتیاز سماج سے باہر، انسانیت سے غیر متعلق اور معاشی یا تمدنی نقطہ نظر سے ناقابل لحاظ ہو۔

جدید ذرائع خبر رسانی اور آمد و رفت نے انسان کو انسانیت کا درس سکھایا نہیں بلکہ ان کو موقع دیا کہ وہ خود ہی انسانیت اور بشریت کا مشاہدہ کریں، اور خود ہی ان سے اپنی سمجھ اور استعداد کے موافق درس حاصل کریں۔

بین قومیت اور بین صوبہ واری | جدید ذرائع آمد و رفت کی بدولت جیسے

جیسے باہمی تعلقات کو بڑھانے میں آسانیاں نمودار ہو رہی ہیں ساری دنیا کے باہمی روابط بڑھتے جا رہے ہیں، اگرچہ انسانوں کی سرشت کچھ ایسی ہی کہ ہر چیز سے اچھائیلا اور برائیاں پیدا کی جاسکتی ہیں اور ریلوں سے بھی فوج کشی کا کام لیا جاتا ہو مگر یہ بھی ایک حقیقت ہو کہ ریلوں اور دخانی جہازوں، برقی تار اور ریڈیو کی بدولت نہ صرف بین اقوامی تعلقات بڑھ گئے، بلکہ ہر ملک کے مختلف صوبوں میں اور ہر صوبے کے حصوں میں تمدنی روابط زیادہ ہو گئے ہیں اسی کی طرف ہم نے گزشتہ صفحوں میں کل ہند تحریکوں کے ضمن میں اشارہ کیا تھا اور یہاں امتیاز اور تخصیص کی خاطر دوبارہ ذکر کر رہے ہیں کہ یہ زیادہ تر ریلوں کا نتیجہ ہو کہ ہندوستان "ایک ملک، ایک قوم اور ایک حکومت" کے مسلک سے قریب تر ہوتا جا رہا ہو اور بین صوبہ داری اور بین ریاستی تعلقات کے پیدا ہونے اور بڑھنے کی وجہ سے خیالوں میں وسعت اور مسلکوں میں یکسانیت نمودار ہو رہی ہو۔ تمام صوبے ایک دوسرے پر اثر انداز اور ایک دوسرے سے اثر پذیر ہو رہے ہیں۔



ساتواں باب

جدید ذرائع نقل و پزیرمی کے معاشی اثرات

قومی اور بین الاقوامی تجارت کا فروغ | صنعتی انقلاب کی وجہ سے پیدائش
دولت میں بہت اضافہ ہوا؛ ملکوں
اور آلوں کی مدد سے جو مال کثیر مقدار میں پیدا کیا جانے لگا اس کا لازمی نتیجہ تجارتی
ترقی میں نمودار ہوا۔ چونکہ بڑے بڑے کارخانوں میں مال تیار کیا جاتا تھا اور انسانی
محنت سے زیادہ ملکوں کی طاقت سے پیدائش دولت میں مدد ملی جاتی تھی نیز بچوں،
نوجوانوں اور عورتوں کی محنت سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا تھا لہذا چیزیں اور بھی کم
قیمت پر تیار ہوتی تھیں۔ آس پاس کے بازاروں اور نزدیک کی منڈیوں تک مال
کے بھیجنے میں کوئی قابل لحاظ دشواری نہیں ہوتی تھی مگر دور کے شہروں تک
مال بھیجنے میں کافی اخراجات ہوتے تھے، سمندر پار ممالک کو مال بھیجنے میں
اور بھی زیادہ اخراجات ہوتے تھے غرض ذرائع نقل و پزیرمی کی خرابی اور گرانی
کی وجہ سے کثیر مقدار میں دولت کی منتقلی عملی اعتبار سے بے حد دشوار اور تجارتی
نقطہ نظر سے قطعی طور پر غیر مفید تھی۔ تجارت اس وقت مجبوراً قیمتی اور ہلکی چیزوں
تک محدود تھی۔ ریشمی کپڑا، کنواری، مشک، جواہر، گرم سالے، نادر مصنوعات
اور اسی قسم کی قیمتی چیزیں زیادہ تر بین الاقوامی خرید و فروخت میں اہمیت رکھتی
تھیں۔ روزمرہ اور معمولی معمولی چیزوں کے لیے ہر ملک اور ہر صوبے کو خود کفایتی

ہونا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں یہ اژدہا دشوار اور تجارتی اعتبار سے سراسر غیر نفع بخش تھا کہ عوام کے استعمال کی چیزیں گاڑھا اور لٹھا، چاؤل اور گیہوں، جوار اور باجرا، بین صوبہ داری یا بین اقوامی تجارت میں اہمیت حاصل کر سکیں۔ بیج پوچھنے تو بڑے پیمانے پر یا قابل لحاظ مقدار میں معمولی معمولی روزمرہ کی چیزوں میں نفع بخش تجارت صرف ریلوں کی ایجاد اور رواج کے بعد ممکن ہوئی۔

صنعتی انقلاب یعنی کلوں کی ایجاد، دخانی قوت کی دریافت اور بڑے بڑے کارخانوں میں دولت کی پیدائش کی وجہ سے اگرچہ دولت کا پیدا کرنا آسان ہو گیا تھا اور کارخانوں میں سامان سستا بھی پیدا ہوتا تھا مگر تیار شدہ سامان کو فروخت کرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ مقامی بازار اور نزدیک کے شہروں میں کوئی خاص دقت نہ ہوتی تھی مگر دور تک مال بھیجنا تقریباً غیر ممکن تھا۔ مال بہت ہوتا تھا، فاصلے کے تناسب سے دقتوں اور اخراجات میں اضافہ ہوتا تھا۔ ان بڑھتی ہوئی دشواریوں کا کامیاب مقابلہ اس وقت ممکن ہوا جب ریلیں اور دخانی جہاز چلنے لگے۔ گویا جدید ذرائع نقل و پزیر نے صنعتی انقلاب کو مکمل بنایا اور صنعتی انقلاب معاشی انقلاب ہو گیا۔ بڑی سے بڑی مقدار میں سامان اور مصنوعات کی درآمد و برآمد نہ صرف آسان بلکہ نفع بخش ہو گئی۔ اب یہ ممکن ہو گیا کہ دور دراز صوبوں سے یا سمندر پار نو آبادیوں سے یا زرعی ممالک سے خام پیداوار منگائی جائے اور اسی کو تیار شدہ سامان کی شکل میں وگنی تنگنی قیمت پر انھیں ممالک میں جہاں سے پہلے آئی تھی، دوبارہ فروخت کیا جائے۔

ہم جانتے ہیں کہ دخانی جہاز کامیابی سے ۱۸۰۰ء میں چلنے شروع ہوئے ۱۸۲۵ء میں ریل کی ایجاد ہوئی تاہم کی ایجاد ۱۸۲۵ء میں ہوئی۔ انیسویں صدی کے وسط تک ان کا عام رواج ہو گیا ان تینوں کی وجہ سے صنعت و حرفت اور تجارت

کو ایسا فروغ ہوا اور اس کی وجہ سے تمام ملکوں کی معاشی حالت اور حیثیت پر ایسے اثرات پڑنے لگے کہ سارے عالم میں معاشی کایا پلٹ ہو گئی۔ غرض صنعتی انقلاب کو کامیاب بنانے کا آخری مرحلہ جدید ذرائع نقل و پزیرے نے طے کیا اور اس کے بعد دنیا کی معاشی حالت و کیفیت میں جلد جلد تبدیلیاں نمودار ہونے لگیں۔

صوبہ واری یا ملک واری خود اکتفائی کا خاتمہ | ریلوں اور دفانی جہازوں کے رواج سے قبل

یعنی آج سے ڈیڑھ صدی قبل تک ہر ملک یا صوبہ خود کفنی ہونے پر مجبور تھا۔ اس کے لیے لازمی تھا کہ اپنے علاقے کی کل آبادی کے لیے نہ صرف ضروری غلہ پیدا کرے بلکہ عام استعمال کی تمام چیزیں خود ہی تیار کرے۔ مثلاً ستر ہویں صدی میں بنگال کے لیے لازمی تھا کہ اپنے علاقے کی تمام آبادی کے لیے جملہ ضروری سامان اور خوردنی اشیاء خود ہی پیدا کرے۔ ضرورت کے وقت قرب و جوار کے علاقوں سے غلہ اور سامان آجایا کرتا تھا۔ مگر پنجاب اور برما سے کثیر مقدار میں روزمرہ کی استعمالی چیزیں درآمد کرنا تو بہر حال ناممکن تھا۔ یہی حال انگلستان یا جرمنی کا تھا۔ تمام انگریزوں کے لیے ضروری غلہ انگلستان ہی میں پیدا کرنا پڑتا تھا اور بجز مستثنیات کے نیکلوں کے دور دراز ملکوں سے غلے کی درآمد ناقابل لحاظ تھی۔

ریلوں اور دفانی جہازوں کے رواج کے بعد یہ مجبوری باقی نہیں رہی۔ برقی تار کی وجہ سے بھی مختلف ملکوں کے بازاروں میں ملک ملک کی اطلالیں پہنچنے لگیں۔ جہاں سب سے زیادہ کفایت سے مال حاصل کیا جاسکتا تھا وہاں سے درآمد شروع ہوئی اور جہاں سب سے زیادہ نفع سے مال فروخت کیا جاسکتا تھا وہاں برآمد شروع ہوئی۔

رفتہ رفتہ برما کا چانول تلنگانہ نے میں اور پنجاب کا گہوں انگلستان میں فروخت

ہونے لگا۔ امریکنوں نے دیکھا کہ وہ اپنے ملک کا میوہ ہندستان میں بھی نفع کے ساتھ فروخت کر سکتے ہیں لہذا انھوں نے ہندستان سے بیوے کی تجارت شروع کی، اس سے قبل ہی مختلف قسم کا پٹرا انگلستان سے آنا شروع ہوا جب تاجروں نے دیکھا کہ کسی خاص صوبے میں قحط کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں اور وہاں کی آبادی حسب معمول غلہ نہیں خرید سکتی ہو مگر کسی دوسرے ملک کی آبادی اپنی دولت مندی کی وجہ سے بیرونی ملکوں کا غلہ خرید سکتی ہو تو انھوں نے خود ہی بغیر فرمایش کے غلے کی درآمد برآمد شروع کر دی۔ جب قحط کے آثار جاتے رہے اور بیرونی غلے کی ضرورت نہ رہی، تو انھوں نے خود ہی برآمد کم کر دی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ حیدر آباد کی روٹی بمبئی اور احمد آباد ہی میں نہیں بلکہ جاپان اور انگلستان میں فروخت ہو سکتی ہو تو انھوں نے اپنے نفع کی خاطر کاروبار شروع کیا۔ عرض فرم رہے تمام ملکوں پر بین الاقوامی تجارت کا اثر پڑنے لگا، تمام چیزوں کی قیمتیں دوسرے ممالک کی مروجہ قیمتوں سے متاثر ہونے لگیں، ہر بازار دوسرے بازاروں پر اثر انداز اور اس سے اثر پذیر ہونے لگا۔

صنعتی اور زرعتی ملکوں کی تفریق | خود اکتفائی کا خاتمہ ہونے سے لازمی طور پر جہاں جو چیز سب سے زیادہ کفایت اور سہولت سے پیدا کی جاسکتی تھی پیدا کی جانے لگی۔ چونکہ دھانی قوت کی دریافت انگلستان میں ہوئی اور اسی ملک میں کلوں کے ذریعے مصنوعات تیار کیے جانے لگے اور وہیں ذرائع نقل و پزیری میں انقلاب کی وجہ سے سب سے پہلے معاشی انقلاب نمودار ہوا تھا اس لیے انگلستان کو سب سے زیادہ موقع ملا کہ اپنے ملک کو صنعتی ملک بنائے۔ قوم کی خوش قسمتی سے ملک و قوم کو بھی ایسے بیدار مغز روشن دماغ مدبر نصیب ہوئے کہ انھوں نے نہ صرف ہر طرح صناعات اور

کارخانوں کی مدد کی بلکہ محکوم ممالک میں سیاسی دباؤ سے ملکی کاروبار کو فروغ دیا۔ اسی زمانے میں انگریزی مقبوضات کی مسلسل توسیع ہو رہی تھی، سیاسی چوڑ توڑ اور فوجی فتوحات سے ہر طرف برطانوی اثر بڑھ رہا تھا۔ غرض وقت کی موافقت، سیاسوں کے تدبیر، حاکموں کی ہمدردی، قوم کی بیداری، تاجروں کی واپس مندی، صنایعوں کی کاریگری اور کارخانے داروں کی کارگزاری سے انگلستان بہت جلد صنعتی ملک بن گیا، امریکہ اور جرمنی، فرانس اور ہالینڈ وغیرہ نے صنعت کو ترقی دینے کی ہر طرح کوشش کی۔ ہر ملک نے اپنی نوآبادیوں اور زیر اثر ملکوں سے خام پیداوار منگوانا اور مصنوعات بنا کر صنعت اور تجارت کے ذریعے دونا فائدہ حاصل کرنا شروع کیا۔ ریلوں اور جہازوں نے حمل و نقل کے زخوں کو اڑا کر کے حاکم اور صنعتی ممالک کو ہر طرح سہولت اور فائدہ پہنچایا اور نیم آزاد ملکوں میں یا نوآبادیوں اور محکوم علاقوں میں زراعت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اسی کا نتیجہ ہوا کہ ایشیا اور افریقہ کے تقریباً تمام ممالک میں صنعتی زوال شروع ہوا۔ سال بسال ان کی صنعتیں تباہ ہونے لگیں اور وہ زراعت کی طرف مجبوراً مایل ہونے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ ایشیائی اور افریقی صنعت کو صرف حاکمیت کی وجہ سے نقصان نہیں پہنچا، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یورپ کی صنعتی ترقی کارخانوں کی اعلیٰ تنظیم، تاجروں کی دوراندیشی، صنایعوں کی کارکردگی وغیرہ ایسے خالص معاشی اسباب ہیں جن کا مقابلہ کرنے کی سکت ہندستانی یا چینی صنعت و حرفت میں نہ تھی مگر محض معاشی اسباب کی وجہ ہی سے ہندوستانی صنعت کا تباہ ہونا آسان نہ تھا، حاکموں نے سیاست ناجایز دباؤ سے صنعت و حرفت کو نقصان پہنچا کر یہاں کے صنایعوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنا آبائی پیشہ ترک کر کے کھیتی باڑی شروع کریں اور ایک کم تر معیار پر پورے بھلے زندگی گزاریں۔

غرض متعدد اثرات کی وجہ سے جن میں ریلوں اور دخانی جہازوں کا بھی

کافی عمل دخل ہے، بہت سے ملک زرعی ملک بننے لگے اور بن گئے۔ چنانچہ آج انگلستان، جرمنی، جاپان، اور ان سے بڑھ کر متحدہ امریکی ریاستیں صنعتی ممالک ہیں اور ہندستان، چین، مصر وغیرہ زراعتی ملک بن گئے ہیں۔

گھریلو صنعتوں کی تباہی | صنعتی انقلاب کے ساتھ ہی جب بڑے بڑے کارخانے وجود میں آنے لگے اور اعلیٰ تنظیم

اور سرمایہ داری کا اثر صنعت و حرفت پر پڑنے لگا تو گھریلو صنعتوں پر زوال آگیا چھوٹے چھوٹے کاریگریوں اور کاروبار کرنے والوں کے لیے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ صنعتی انقلاب کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے محفوظ رہ سکیں چنانچہ یکے بعد دیگرے تمام گھریلو صنعتیں ختم ہونے لگیں، صنایع کارخانوں میں ملازم ہو گئے یا انتہائی مصیبت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے جب ریلوں اور جہازوں کی صنعتی مال کو سارے ملک میں پھیلانے کے علاوہ اُسے دُنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانا شروع کیا تو ہر ملک کی گھریلو صنعتیں تباہ ہونے لگیں، ان میں جو کچھ بھی سکتا باقی رہتا تھا اس کا خاتمہ موٹر بسوں اور لاریلوں نے کر دیا، اب تو گاؤں گاؤں بیرونی ممالک کا تیار کردہ کپڑا دور دراز مقامات کی مصنوعات اور روزمرہ کی استعمالی چیزیں نظر آتی ہیں جو دیکھنے میں نفیس ہوتی ہیں اور سستی بھی ہوتی ہیں! بھلا ہو قومیت اور قوم پرور تحریکوں کا جن کی وجہ سے لوگوں میں ایثار کا محو بڑا بہت مادہ پیدا ہوا ہے اور قومی صنعت کی خاطر قربانی کر کے ملکی اور دیسی مال خرید کر ان قدیم گھریلو صنعتوں کو زندہ رکھ رہے ہیں ورنہ جدید ذرائع نقل و پزیری، سرمایہ داری اور حاکمیت نے مل کر گھریلو صنعتوں کو کچل ہی دیا ہوتا اب کم سے کم وہ زندہ تو ہیں، جانکھی اور مرض موت میں گرفتار نہیں، مگر ان کا وجود ہی امید افزا ہے، جب تک سانس تب تک آس! یہ امکان بہر حال ہے کہ ان نیم مُردہ

صنعتوں میں از سر نو جان پیدا ہو سکے گی اور وہ سرمایہ داری کے ناجائز اور ناموافق دباؤ سے محفوظ رہ سکیں گی۔

معاشی زندگی میں تبدیلیاں کاشت اور دولت پیدا کرنے کے مقصد میں تغیر

اہم نہ ہوتا اور نہ اُس کے عالمگیر اثرات نمودار ہوتے اگر صنعتی انقلاب کو مکمل کرنے کے لیے خبر سانی اور نقل پھیری کے ذرائع میں انقلاب نہ ہوتا۔ اس معاشی انقلاب کی بدولت جو اہم ترین اثرات نمودار ہوئے ہیں ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے کر دیا ہے پھر بھی چند ایسے اثرات باقی ہیں جن کی وجہ سے معاشی زندگی میں یک لخت تغیر واقع ہوا۔ کاشت کاری اور دولت آفرینی میں تغیر ہوا، مسئلہ آبادی کی نوعیت بدل گئی اور قحطوں کی نوعیت میں بھی بڑا فرق ہوا۔

خود اکتفائی کے دور میں ہر کسان جانتا تھا کہ وہ جس چیز کی کاشت کرے گا وہ کس کام آئے گی؟ وہ زیادہ تر خود دینی اور کم تر استعمالی زرعی پیداوار حاصل کرتا تھا، اپنی پیداوار سے خود کے استعمال کے لیے جو کچھ نصیب ہو سکتا تھا لے لیتا اور بقیہ تباؤ میں یا خدمتوں کے معاوضے میں یا سرکاری لگان میں تقسیم کر دیتا تھا۔ اسی طرح تمام صنایع اپنی بنائی ہوئی چیزوں سے خود مستفید ہوتے تھے اور دوسروں کو اپنی مصنوعات دیکر ضروری چیزیں حاصل کرتے تھے۔ اب یہ باتیں کم ہو گئی ہیں اور کم ہوتی جا رہی ہیں ہندوستان ہی کو لیجئے۔ صوبہ بنگال میں جوٹ کی اس قدر کاشت بڑھ گئی ہے کہ بعض وسیع علاقوں میں خود دینی اشیاء درآمد کرنی پڑتی ہیں ریاست حیدر آباد کے علاقے مرہٹواڑی میں روئی کی کاشت بھی بہت بڑھ گئی ہے، بنگال اور حیدر آباد کے ان کھیتوں میں جہاں تین سو سال قبل غلہ پیدا کیا جاتا تھا اب

جوٹ اور کپاس کی کاشت ہو رہی ہو۔ محض اس لیے کہ کاشتکاروں کو غلہ پیدا کرنے کی بجائے جوٹ اور کپاس کی کاشت کرنے میں کسی قدر زیادہ نفع اور سہولت ہو۔ گویا کاشت کا مقصد اب روپیہ پیدا کرنا، آرام اٹھانا اور نفع حاصل کرنا ہو، یہ تو ان کو معلوم ہو کہ روپیہ ہوگا تو وہ جو چیز چاہیں گے خرید سکیں گے لہذا وہ بھی اپنے فائدے کی خاطر غلہ پیدا کرنے کی بجائے جوٹ اور روئی کی کاشت کر رہے ہیں کیونکہ جوٹ اور روئی کے خریدار موجود ہیں۔ غرض ریلوں کی وجہ سے کاشت کے مقصد میں بھی تبدیلی ہوئی اور ذاتی ضرورت سے مقدم خریدار کی ضرورت قرار پائی۔ اس قسم کی کاشت کو معاشیات کی اصطلاح میں منفعتی کاشت، Money Crops کہتے ہیں۔

یورپ کے صنعتی ممالک میں کئی علاقے ہیں۔ جہاں صنعتوں کی تخصیص ہو چکی ہو ہندستان میں چمڑے کے کارخانے کان پور میں۔ روئی کے کارخانے بمبئی اور احمد آباد میں، اور لوہے کا کارخانہ جمشید پور میں ہو۔ ان کارخانوں میں جو مال پیدا کیا جاتا ہو کیا وہ صرف مقامی استعمال کے لیے پیدا کیا جاتا ہو؟ سابق چکوسلو ویکیا میں ایک کارخانہ تھا جو محض ہندستانی عورتوں کے شوق ذوق کے مطابق چوڑیاں تیار کرتا تھا، اس کارخانے کے بعض ملازموں کو اتنا بھی نہیں معلوم تھا کہ ہندستان کے کیا رسوم و رواج ہیں، ان کی کیا ضرورتیں ہیں اور ان کے کیا مذاق ہیں! ان سب باتوں کا تعین کارخانے کے مالک، منتظم اور آجر کرتے تھے نئی وضع بنانے والے وضعیں بناتے تھے، ماہر واقف کار چوڑیوں کے پائیوں کا تعین کرتے تھے اور انھیں کی ہدایتوں کے موافق چوڑیاں بنتی تھیں، مختلف مزدوروں اور ملازموں کو اجرت دے دی جاتی تھی اور تمام تیار شدہ مال ہندستان بھیج دیا جاتا تھا۔ اسی طرح بمبائل (جنوبی امریکہ) میں کافی کے

کاشت کار، چین اور آسام کی چائے کے کاشت کار خریداروں کی خاطر دولت پیدا کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال صرف جدید ذرائع نقل و سیر کی بدولت نمودار نہیں ہوئی، اعلیٰ صنعتیت، انتہائی سرمایہ داری اور ملوکیت کو بھی اس صورت حال کے پیدا کرنے میں عمل دخل ہو مگر دیلوں اور جہازوں کا اس میں اثر شریک ہے لہذا اس بات کا ذکر بھی ضروری تھا کہ موجودہ زمانے میں دولت آفرینی اور کاشت کے مقاصد میں تغیر ہو گیا ہے، ذاتی احتیاج، ذاتی ضرورت اور ذاتی شوق کا اثر ذلیل ہو گیا، خریدار کی ضرورت اور خریداروں کے شوق کا اثر اہم تر ہو گیا ہے۔

ہندوستان میں بالعموم اور حیدرآباد میں بالخصوص ”ترکی ٹوپی“ کا استعمال مسلمان بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ ٹوپیاں ترکی میں بنتی ہیں اور ترکی ٹوپی خریدنے سے وہ بالواسطہ ترکی کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ ان میں کتنے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ یہ ٹوپیاں خالص یورپی، زیادہ تر اطالوی ہیں، جس کو خریدنے سے ترکوں کو دھڑی برابر کا فائدہ نہیں۔ نادان لوگ ”ترکی ٹوپی“ کے نام سے مغالطے میں گرفتار ہوتے ہیں اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ دولت آفرینی کا مقصد بدل گیا ہے اور فن اشتہار بازی کی بدولت قصداً نادان کا ہوں کو غلطے میں رکھا جاتا ہے۔

مسئلہ آبادی کی نوعیت میں تغیر | گزشتہ صدی کے وسط تک ہر ملک کے لیے یہ ضروری خود دینی اشیاء پیدا کرے، لہذا گزشتہ صدی کے وسط تک مسئلہ آبادی کا دار و مدار غذا کی مقدار پر تھا۔ سوال یہ تھا کہ جس قدر آبادی کسی ملک میں ہو اس کے لیے کافی کھانے پینے کی چیزیں پیدا ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ جہاں

کافی غذا ہوتی تھی آبادی بڑھتی تھی اور جہاں کافی غذا نہیں پیدا ہوتی تھی وہاں فاقہ کشی قحط، بیماری اور وبایں پھیلی تھیں۔ ہر ملک کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنے ملک کی آبادی کے لیے خود ہی غلہ پیدا کرے اور برے وقتوں کے لیے محفوظ رکھ لے۔ دور دراز ملکوں کو غلہ برآمد کرنے کا امکان ہی نہ تھا لہذا جو کچھ غلہ کسی ملک میں پیدا ہوتا تھا۔ وہ آخر کار اسی ملک میں صرف بھی ہوتا تھا۔ گویا مسئلہ آبادی کی نوعیت بالکل ملکی یا قومی تھی۔

صنعتی انقلاب اور نقل و حرکت پریری کے ذرائع میں انقلاب کے بعد یہ ممکن ہو گیا ہو کہ نہ صرف گیہوں، چانول، دال، بلکہ دودھ، دہی، مکھن، کرکاری، گوشت جیسی جلد خراب ہو جانے والی چیزوں کی برآمد و درآمد ہو سکے بشرطیکہ اس کے خریدار موجود ہوں اور نہ صرف غور دنی اشیاء کی قیمت بلکہ منتقلی کے اخراجات اور تاجروں کا محنتانہ ادا کر سکیں۔

جو قومیں صنعتی ترقی کی وجہ سے مال دار ہو رہی تھیں انھوں نے اس بات کو جلد معلوم کر لیا کہ صنعت و حرفت میں زیادہ منافع ملتا ہو اور مال دار ہونے کا زیادہ قرینہ ہو، انھیں کھانے پینے کی چیزیں پیدا کرنے کی پروا نہ رہی کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ جب تک وہ زور دار رہیں گے اور ان میں قوت خرید رہے گی اُس وقت تک دُنیا بھر سے جو چاہیں گے کھانے پینے کی چیزیں منگاسکیں گے چنانچہ حقیقت میں صنعتی ملکوں نے دوسرے ملکوں سے کھانے پینے کی چیزیں منگانی شروع کیں مثلاً انگلستان میں برازیل اور آسٹریلیا سے گوشت، ہالینڈ اور سویٹمان سے دودھ، مکھن، ہندستان سے گیہوں آنا شروع ہوا۔

اسی طرح چند سال کے اندر ہی مسئلہ آبادی کی نوعیت ملکی یا قومی نہیں رہی بلکہ بین ملکی اور بین اقوامی ہو گئی۔ معاشی انقلاب سے پہلے مسئلہ آبادی کا

مرکزی اور اساسی جزو، غذا کا مسئلہ تھا مسئلہ آبادی کے حل کرنے کا انحصار اس مقدار غذا پر تھا جو اندرون ملک پیدا کی جاسکے۔ معاشی انقلاب کے بعد مسئلہ آبادی کا مرکزی اور اساسی جزو دولت یا روزگار کا مسئلہ بن گیا۔ مسئلہ آبادی کے لیے اندرون ملک دولت کا پیدا کرنا ضروری نہ رہا دولت مند ہونا یا برسر روزگار ہونا کافی تھا۔ رتنی یافتہ قومیں نہ صرف صنعت و حرفت بلکہ تجارت، جہاز رانی، اور حکومت کی وجہ سے اپنے ذرائع معاش میں اضافہ کرنے لگیں اور دولت مند ہوتی گئیں۔ زغال پتھر تو میں گھریلو صنعتوں کی تباہی سے یوں ہی نقصان اٹھا چکی تھیں، حکومت کی وجہ سے وہ کئی ذرائع معاش سے محروم ہو گئیں۔ ان کے لیے صرف زراعت ایک پیشہ رہا۔ اگرچہ زراعت میں منافع بھی کم ہو خطرے بھی زیادہ ہیں اور محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہو مگر مجبوری کا نام صبری، حکومت کھونے کے بعد یا بے ہنری میں محکوم قومیں کر ہی کیا سکتی تھیں؟ وہ محنت شاقہ کر کے خام پیداوار اہل خود دنیٰ اشیاء پیدا کرنے لگیں اور بُرے بھلے زندگی گزارنی شروع کی۔ پہلے زمانے میں جب زراعتی پیداوار کی افراط ہوتی تھی تو اس کو قحط سالیوں کے لیے کھتوں میں محفوظ رکھا جاتا تھا اور وقت ضرورت استعمال کرتے تھے۔ ریلوں کے رواج کے بعد یہ صورت باقی نہیں رہی۔ نہ صرف زراعتی پیداوار کا بیشتر حصہ برآمد کیا جانے لگا بلکہ جب کبھی اور جہاں کہیں زائد منافع حاصل ہوا غلے کی برآمد شروع ہو گئی۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ آسٹریا (سابق آسٹریا) میں جس قدر مقدار غذا پیدا ہوتی ہو وہ صرف اس صوبے کی راج دھانی وینیا کی آبادی کے لیے صرف نصف سال تک کافی ہوتی ہو۔ پھر راج دھانی کی آبادی دوسرے نصف سال تک اور بقیہ صوبے کی آبادی کل سال تک کیوں کر زندہ رہتی ہو؟ صرف

درآمد شدہ غذا پر! اور درآمد کیوں ہوتی ہے؟ محض اس وجہ سے کہ وہاں کی مصنوعات کی مانگ دوسرے ملکوں میں ہے ان مصنوعات کو لوگ خریدتے ہیں، جس کی وجہ سے آسٹریا کے باشندے پیسہ حاصل کرتے ہیں ان میں گویا قوت خرید پیدا ہوتی ہے اور وہ من بھاتی غذائیں دوسرے ملکوں سے منگوا سکتے ہیں۔

یہ سب باتیں معاشی انقلاب سے پہلے ناممکن تھیں مسئلہ آبادی کی نوعیت کو ریلوں اور دفائی جہازوں نے بدل دیا۔ اس کا تعلق مقدار غذا سے نہیں رہا۔ اب یہ سوال ہو گیا ہے کہ مسئلہ آبادی کو حل کرنا ہے تو روزگار حاصل کرو، روزگار کے ذریعے پیسہ کماد اور پیسہ دے کر جو چاہو خرید لو، اسی انقلاب کا نتیجہ ہے کہ ہندستان کے دولت مند اور مرفہ حال لوگوں کے علاوہ متوسط طبقوں کے کھاتے پیتے گھرانوں کو بھی بھانت بھانت کی غذائیں نصیب ہوتی ہیں۔ بسکٹ اور دودھ، جام اور چٹنیاں، مکھن اور میوہ یورپ سے آتا ہے، عرب کی کھجور ہر بازار میں فروخت ہوتی ہے۔ لذیذ غذاؤں کے شوقینوں کے لیے نہایت ملائم روٹی بنانے کے لیے کنیڈا سے گہیوں درآمد کیا جاتا ہے۔

قحطوں کی نوعیت بدل گئی | پہلے قحطوں کی وجہ قلت غذا ہوا کرتی تھی جب کسی ملک میں خوردنی اشیاء کم یا ہو جاتیں تو گرانی بڑھنے لگتی تھی، جو غلہ کھتوں میں محفوظ رکھا جاتا تھا اُسے خرچ کیا جاتا تھا مگر شدید مصیبتوں میں یا ضلوع کی مسلسل خرابی ہونے سے لوگ فاقے کرنے پر مجبور ہوتے تھے اور شدید ترین قحطوں میں لاکھوں مرتے بھی تھے نقل پزیری کے ذرائع اس قدر خراب تھے اور خبر رسانی بھی دُور دراز ممالک یا صوبوں تک مشکل تھی لہذا باہر سے خوردنی اشیاء کا درآمد کیا جانا (مستثنیٰ صورتوں کے علاوہ) ناممکن تھا۔ قدیم ترین زمانے سے لے کر گزشتہ صدی

کے وسط تک جتنے قحط واقع ہوئے وہ تمام تر قلتِ غذا کی وجہ سے نمودار ہوئے ان قحطوں میں غریبوں کے ساتھ ساتھ امیروں اور دولت مندوں نے بھی مصیبتیں اٹھائیں، انھوں نے بھی فاتے کیے، بھوک کی تکلیف جھیلی اور مال و زر رکھتے ہوئے غذا کے لیے تڑپ تڑپ کر جان دی۔ ملک میں کھانے پینے کی چیزیں ہی نہیں ہوتی تھیں جس سے وہ اپنی بھوک دُور کر سکتے، باہر سے غذا درآمد کرنا ناممکن تھا لہذا مجبوراً انھیں بھی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

جدید ذرائع نقل و پزیری نے قحطوں کی نوعیت بدل دی چنانچہ موجودہ زمانے ہی میں نہیں بلکہ گزشتہ ستر اسی برس میں جہاں جہاں قحط پڑے ہیں اور قحط زدہ لوگ فنا ہو گئے ہیں تو اس کی اصل وجہ قلتِ غذا نہیں بلکہ قلتِ زر ہے۔ جب سے ریلوں اور وہابی جہازوں کا رواج ہو گیا ہے یہ امکانی بات ہو گئی ہے کہ قحط زدہ علاقوں میں دُور دراز ملکوں سے غلہ درآمد کیا جائے۔

اگر کوئی قوم مرفہ الحال ہو اور معمولی طور پر گزر بسر کرنے کے علاوہ پس انداز بھی کر سکتی ہو تو اس کے لیے قحط کا کوئی خطرہ نہیں، ریلوں اور جہازوں کی وجہ سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ جہاں کہیں کسی قوم کو غلے کی ضرورت ہوگی مطلوبہ مقدار روانہ کی جاسکے گی۔ بشرطیکہ اس قوم میں قوتِ خرید ہو یعنی درآمد شدہ غلے کی قیمت، اخراجات نقل و حمل اور معمولی تاجرانہ نفع ادا کر سکنے کی صلاحیت ہو! جب تک ریلیں نہ بھیں اور غیر ملکوں میں زائد نفع حاصل کرنے کا امکان نہ تھا سیڑھ سا ہو کار، بنیے اور غلہ فروش مقامی پیداوار مقامی آبادی کے ہاتھ ہی فروخت کر سکتے تھے مگر جب سے ریلیں جاری ہو گئی ہیں غلہ فروشوں کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ قحط زدہ علاقوں سے بھی غلہ درآمد کریں!! بظاہر تو یہ تعجب کی بات ہے کہ جس علاقے میں قحط ہو اُسی علاقے سے غلہ باہر بھیجا جائے

مگر غذا غور کرنے سے یہ بظاہر متضاد باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ قحط سالی کی وجہ سے (چونکہ کھیتوں میں کام نہیں رہتا) لوگوں کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے وہ حسب سابق پیٹ بھر غذا نہیں خرید سکتے، جب لاکھوں آدمی کفایت پر مجبور ہو جاتے ہیں اور مقابلتاً کم خریدتے ہیں اور کم تر قسم کی غذا استعمال کرتے ہیں تو غلہ فروشوں کو نفع کی خاطر غلہ برآمد کرنے کا خیال ہوتا ہے۔ چونکہ قحط زدہ علاقوں سے غلہ برآمد کرنے کی نہ تو مانگت ہے اور نہ یہ نامکن ہے لہذا انسان اپنی خود غرضانہ سرشت میں مبتلا ہو کر قحط کی شدت میں اور اضافہ کرتا ہے۔

یہ محض قیاس آریاں اور خیال آفرینیاں نہیں بلکہ حقیقی زندگی کی تلخ داستان ہے۔ ۱۹۱۶ء کے روسی انقلاب کے بعد روس میں قحط کیوں پڑا؟ ۱۹۱۷ء میں کیا ہندستان میں ریلیں نہیں بھٹیں؟ ۱۹۱۸ء میں جب کہ خود ہندستان میں غلے کی شدید ضرورت تھی غلہ برآمد کیا جا رہا تھا۔ اس قسم کی بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ریلوں کے رواج کے بعد سے قحط قلت زریا قلت قوت خرید کا نتیجہ ہے، مقدار غذا کی کثرت و قلت کی وہ اہمیت نہیں رہی جو گزشتہ زمانوں میں تھی جس طرح معمولی دنوں میں شہر کے چند خاندان یا افراد فاقہ کرنے پر مجبور ہوتے (حالانکہ چائے خانوں، ہوٹلوں اور دکانوں اور ہسٹران وغیرہ میں کھانے پینے کی چیزیں موجود رہتی ہیں) اسی طرح موجودہ زمانے کی قحط سالیوں میں صرف وہ جماعتیں یا طبقے فاقہ کرتے ہیں جو ہنہی دست ہیں۔

جس طرح گولی دودھ، دہی، مکھن، گھی اس شخص کو دیتے ہیں جو اس کو روپیہ یا مطلوبہ معاوضہ دے سکے اور انھیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ خود اسی کے محلے میں کتنے بچے ہیں جو دودھ کے لیے تہللا رہے ہیں اور

جس طرح ہوٹلوں میں ہر اس شخص کو جو روپیہ ادا کر سکے مطلوبہ غذا دی جاتی ہو (حالانکہ انھیں لمحوں میں ہزاروں نہیں تو سیکڑوں لوگ ہر شہر میں ہوتے ہیں جن پر تیسرا مسلسل فاقہ ہوتا ہو) اسی طرح عالمی تجارت اور بین الاقوامی کاروبار میں اس قوم یا آبادی کو چیزیں مل سکتی ہیں جو معاوضہ ادا کر سکے۔

نظام معیشت کی یہ ہمیشہ سے خصوصیت رہی ہو کہ سب سے زیادہ مستحق اور سب سے زیادہ ضرورت مند کو نہیں بلکہ زرداروں اور گاہکوں کے ہاتھ چیزیں فروخت کی جاتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہو کہ جب سے ریلوں اور جہازوں کی وجہ سے ساری دنیا ایک بازار ہوتی جا رہی ہو خوردنی اشیاء بھی اسی قوم کو فروخت کی جاتی ہیں جو اس کی خریدار ہو۔

غرض ذرائع نقل و پزیری میں انقلاب کی وجہ سے قحطوں کا بنیادی مسئلہ یہ نہیں رہا کہ کھانے پینے کی چیزیں مفقود ہیں بلکہ یہ کہ کھانے پینے کی چیزیں نہیں خریدی جاسکتی ہیں۔ غریبوں کے لیے قحطوں اور فاقوں کی اہمیت بدستور باقی ہو صرف مال داروں اور زرداروں کے لیے قحطوں اور فاقوں کا خطرہ مفقود ہو گیا! آپ کا دل چاہے تو اسی کو ترقی سے تعبیر کر لیجئے!

آٹھواں باب

ریلوں کا تاریک پہلو

ریلوں کے مختلف اثرات معلوم کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے لیے ریلیں سرما پانچمت، اول سے آخر تک فائدہ محض نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ریلوں کی بدولت ہندوستان کو بعض سماجی اور تمدنی فوائد حاصل ہوئے جس میں قومیت کا فروغ اور ایک ملکی احساس "سب سے زیادہ اہم ہیں، مگر ہماری نیم غلامی ریلوں کا سابقہ اور حالیہ خسارہ صنعتوں کی تباہی، فحشوں کی کثرت، گمراہی، دوا می نیم فائدہ کشی وغیرہ ایسے اثرات ہیں جو کسی طرح نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔

ایسے زمانے میں جو جدید ہتدیب و تمدن کا دل دادہ ہونے کی وجہ سے ریلوں کی افادیت پر پورا بھروسہ کرتا ہو ریلوں کے خلاف کچھ لکھنا یا اس کے مضر پہلو کو واضح کرنا بڑی نادانی ہو۔ عوام کے سیاسی اعتقادوں اور نیم تعلیمیتہ پہلک خیالوں کی ہم نوائی کرنے میں کوئی ہرج کی بات نہیں، غالباً مقولہ اس فائدہ ہی ہے مگر عام لوگوں کے خیالات کے خلاف اور سرکاری بیانون کی تردید میں کچھ کہنا آسان نہیں تاہم علمی تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے ریلوں کا تاریک پہلو واضح کرنا ضروری ہو۔

مالی اعتبار سے ہندوستان کی ریلیں دنیا کی کاروباری تاریخ میں بڑی

عبرت ناک مثال پیش کرتی ہیں۔ نہ معلوم ان ریلوں کی وجہ سے ہمیں گزشتہ صدی میں کتنا خسارہ ہوا۔ بعضوں کا اندازہ ہے کہ ان کی بدولت ڈیڑھ دو ارب کا نقصان ہوا۔ زمانہ تجدید میں یعنی ۱۹۲۲ء کے نصف کے بعد سے اب تک ریلوں پر ۶۶ کروڑ کا بار ہے اسی بار کا سود در سو سالانہ ۳ کروڑ ہوتا ہے۔ ریلوں نے حکومت ہند سے جو معاہدہ کیا تھا اس کو بحال رکھنا بھی ناممکن ہو گیا ہے اور ریلوں کی مسلسل وعدہ خلافی اور معاہدہ شکنی کی تلخ داستان ختم نہیں ہوئی۔ ریلوں کی سرگزشت ہندستان کی معاشی تاریخ کا سب سے زیادہ افسوس ناک حصہ ہے۔ غیر ذمہ دار افراد، سرکار کے پیشینہ ور مداح اور مغربیت کے کورانہ نقال ریلوں کی تعریف میں کہتے ہیں کہ ان کی وجہ سے قحطوں کا خطرہ جاتا رہا ہے! مگر ہندستان کی معاشی تاریخ اس کے بالکل برعکس شہادت دیتی ہے۔ ہندستان میں ریلیں جاری ہو کر تین چوتھائی صدی گزر چکی ہے، ان پچھتر سال میں دس مرتبہ بڑے بڑے قحط پڑ چکے اور ہر قحط میں دس دس بیس بیس لاکھ انسانوں کی جانیں گئیں ساری دنیا کی معاشی تاریخ میں اس سے زیادہ مغالطہ پرور اور سرسہر جھوٹا دعویٰ اور کوئی نہیں کہ ریلوں کی وجہ سے ہندستان میں قحط دور ہو گئے اس جسارت کو تو دیکھئے کہ ریلوں کی بدولت قحطوں کی کثرت و شدت میں اضافہ ہو، اس کی وجہ سے گرامی پھیلے، اسی کی بدولت بے روزگاری میں اضافہ ہو، فاقوں کی نوبت آئے اور نیم فاقہ کشی میں کروڑوں افراد مبتلا ہو جائیں مگر پھر بھی یہی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ریلوں نے قحط کو دور کیا۔ علم معاشیات نے ریلوں کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے کہ اول غلے کے قحط ہوتے تھے اب زر کے قحط ہوتے ہیں یعنی اول غلہ نہ ہونے کی وجہ سے لوگ مرتے تھے اب غلہ خرید نہیں سکنے کی وجہ سے بھوک کی تکلیف سہتے سہتے، نیم فاقوں سے نڈھال

ہوتے ہوتے، کوفت اور اذیت کی موت مرتے ہیں۔ بات ایک ہی ہوئی بھوکوں
مرنا اول بھی ان کی قسمت میں تھا اب بھی ہمال داروں، زرداروں، سرمایہ داروں
ہمدہ داروں، ساہوکاروں کو بے شک فائدہ ہوا، ان کے لیے یقینی طور پر قحط
کا خطرہ جاتا رہا مگر عوام کے لیے ریلوں نے یہ امکان پیدا کیا کہ عین قحط کے
زمانے میں ملحقہ علاقے سے غلہ باہر بھیجا جائے!! یہ تو بظاہر عجیب بات ہو اور
غیر معتبر بھی۔ اول اعتبار کی خاطر دو حوالے کیجیے پھر توجیہ پیش کی جائے گی۔
ریش چندر دت ہندستان کے مشہور معاشیات کے عالموں میں شمار
کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے جو ہندستان کی معاشی تاریخ لکھی ہے وہ مستند مانی
جاتی ہو اور اس کے ترجمے متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ”ہمدہ و کٹوریہ میں ہندستان
کی معاشی تاریخ“ میں دت صاحب نے لکھا ہے :-

”In 1876 when India was on the brink of one of the severest famines of the country, she exported a larger quantity of food grains than she had ever done in any preceding year.” 1.

۱۸۷۶ء میں ہندستان
انیسویں صدی کے سخت ترین قحط کے بالکل
قریب تھا اس نے دوسرے برسوں کے
مقابلے میں زیادہ غلہ برآمد کیا۔ ۱۵

اسی طرح بمبئی کانج کے دو پروفیسر واڈیا اور جوشی نے اپنی مشترکہ تصنیف
”دولت ہندوستان“ میں لکھا ہے :-

1. R. C. Dutt : “Economic History of India in the Victorian Age.”
Trubner, London, 1906, P. 349.

“ Whilst hundreds and thousands died of starvation in one province, the adjoining provinces were exporting loads of wheat and grain to other parts of the world.” 2.

”جب کہ سیکڑوں اور ہزاروں آدمی قحط سے ایک صوبے میں مر رہے تھے قریب کے صوبے منوں گیسوں اور غلہ دنیا کے دوسرے حصوں کو برآمد کر رہے تھے۔“ ۲

اس کی وجہ صرف یہی تھی اور ہو کہ قحط کش لوگ غربت کی وجہ سے غلہ خرید نہیں سکتے ہیں لہذا کاروباری لوگ اپنا غلہ نفع کی خاطر دوسری منڈیوں میں فروخت کے لیے بھیج دیتے ہیں ان حقائق کے مد نظر ہندوستانی ریلوں کے حق میں یہ دعویٰ کرنا کہ ان کی وجہ سے قحط ”دور“ ہو گئے جسارت کی انتہا ہو اور معاشی تاریخ کو جھٹلانا ہو۔ اس سے بڑھ کر غلط دعوے کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔

خلاصہ اور خاتمہ | یہ صحیح ہو کہ ریلیں نہ ہوتیں تو سرکاری تنظیم اتنی اعلیٰ نہ ہوتی مگر یہ بھی تو سچ ہو کہ ریلیں نہ ہوتیں تو فوجی شکنجہ اتنا مضبوط نہ ہوتا۔ یہ صحیح ہو کہ ریلوں کی وجہ سے بعض بڑے بڑے زمینداروں اور کاشت کاروں کو بین الاقوامی نرخ سے فائدہ ہوا اور ہوتا رہتا ہو مگر یہ بھی ہو کہ ریلوں کی چھ سے بدلیسی مقابلہ بہت موثر ہوا اور ریلوں کی نرخ کی پالیسی سے ہندوستانی گھریلو صنعتوں کو سخت نقصان پہنچا، گویا ریلوں کی وجہ سے کپڑا سستے داموں

فروخت ہو سکتا ہے جو بظاہر خریداروں کا فائدہ ہے مگر ہندوستانی صنعتوں کی تباہی کی وجہ سے عام بے روزگاری میں جو اضافہ ہو رہا ہے اس کا بار بھی کماد پوتوں پر پڑ رہا ہے اور بدیسی ”ستا“ مال خریدنے کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے بھائی بہن بے کاری میں مبتلا ہو کر نہ صرف مصیبتیں بھیلے ہیں بلکہ ہمیں پر بار بنتے ہیں۔ چند ہی خوش قسمت گھرانے سارے ہندوستان میں ہیں جنہیں بے روزگاری کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا ہوگا۔ چند ہی ہوشیار اور چالاک گھرانے ایسے ہیں جہاں کے سب مرد برسرِ روزگار ہیں، معقول آمدنیاں حاصل کر رہے ہیں، اور ان آمدنیوں سے کتے دامنوں بدیسی سامان خرید کر منے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ورنہ عام طور پر اس کے بالکل برعکس ہر طرف بے روزگاری اور کم روزگاری پھیلی ہوئی ہے بے روزگاروں کا بار کماد پوتوں پر پڑ رہا ہے اور بدیسی سستی چیزیں خریدنے کی وجہ سے بالآخر انھیں اپنے ہی خاندانِ اول کو بے روزگاری میں مبتلا ہوتا دیکھنا پڑتا ہے۔

جدید ذرائع نقل و پزیری کی مبالغہ آمیز مداحی اور بھی کئی طرح کی جاتی ہے ”کل ہندوستانی“ یا ”بین الاقوامی“ نام ہندو علمی اور تمدنی اجتماعوں کی اہمیت بہت بڑھا چڑھا کر بیان کی جاتی ہے۔ اس بات کو چھپایا جاتا ہے کہ کئی کانفرنسیں زیادہ تر محض تماشہ اور سرکار سے آمد و رفت کا کرایہ حاصل کرنے کا بہانہ ہوتی ہیں جہاں کاروباری اور سنجیدہ اغراض کے لیے بین صوبہ داری اور بین الاقوامی کانفرنسیں ہوتی ہیں وہاں محض نمود و نمائش اور تماشہ بازی کے ”میلے“ بھی ہوتے ہیں۔ سیروسیاحت کی بدولت وسعتِ نظر اور وسعتِ معلومات اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ سیاح علم کا شوقین ہو اور سنجیدہ طبیعت رکھتا ہو۔ یا کم از کم اس غرض کو بھی ملحوظ رکھتا ہو کہ غیر ملکوں میں جا کر علم و دہن حاصل کرنا، کاروباری طریقہ

لیکھنا، تجربہ اٹھانا اس کا فرض ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے سیاحوں کی کچھ نہ کچھ تعداد ضرور ہوتی ہو جو اندرونی اور بیرونی سفر اختیار کر کے ہندوستانی صنعت و حرفت، تجارت، زراعت یا علم و تحقیق کو فائدہ پہنچا رہے ہیں مگر ایسے عیش پسندوں اور نفس پرستوں کی بھی کمی نہیں جنہیں محض جدید ذرائع نقل و پزیری کی سہولت کی وجہ سے ترغیب ہوتی ہو کہ وہ اپنے گھرانے کی دولت غارت کریں۔ ایسے سیکڑوں نہیں ہزاروں نواب زادے اور امیرزادے ہیں جو غیر مالک میں محض عیش و آرام کی خاطر ہیندو قیام کرتے ہیں اور سالہا سال گنواتے ہیں۔ آرام پسندوں کی ٹولیاں ہر سال دنیا کے مختلف ملکوں خاص کر یورپ کی سیر کو نکلتی اور عیش پسندیوں میں روپیہ غارت کر کے ناکام و نامراد واپس آتی ہیں۔ ان کا روز کا مشغلہ بے کار لہو و لعب اور ناقابل ذکر اڈوں کا طواف ہوتا ہی۔ اس قسم کی آوارہ گردی کو بھی موجودہ زمانے کی اصطلاح میں ”تعلیمی سفر“ سے تعبیر کیا جاتا ہو اور ایسی طواف بازیاں بھی ریلوں کی برکتوں اور نعمتوں میں گنوائی جاتی ہیں!

کوئی کہاں تک تفصیل میں جائے؟ کسی نقطہ نظر سے غور کر لیجئے آپ ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہندوستان کے لیے ریلیں فائدہ مند اور مصیبتوں کا سرچشمہ ثابت ہوئیں، ریلوں کے معاشی، سیاسی اور تمدنی اثرات میں نقصان دہ اور فائدہ بخش دونوں وصف موجود ہیں، ریلوں میں فی نفسہ کوئی برائی نہ تھی مگر ہندوستان میں ان کا مقصد اور مصرف ملوکیت کو تقویت دینا رہا ہو لہذا ان سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا ہو۔ عرصہ ہوا کسی کتاب میں میں نے پڑھا تھا کہ ”تلوار ظالم کے ہاتھ میں جبر و قہر کا ذریعہ ہو مگر ایک دانش مند اور بہادر حاکم کے ہاتھ میں

وہی تلوار محافظت اور داد رسی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔“ ریلوں کے اثرات پر کامل غور اور مقدور بھر تحقیق کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آزاد ملکوں اور دانش مند حاکموں کے عہد میں ریلیں قومی مرفہ الحالی اور تمدنی خوش حالی کا ذریعہ ہوتی ہیں کہ محکوم ملکوں میں ان کی افادیت اور فیض رسانی بڑی حد تک کم ہو جاتی ہے۔



شماریات نقل پزیری

یعنے

آمد و رفت اور نقل و حمل کے بارے میں بعض دلچسپ اور سبق آموز

اعداد و شمار



عنوانوں کی فہرست

صفحہ کا نمبر

- (i) ابتدائی تقابلی اعداد ۱۰۷
- (ii) جدید وضع کی بے گردی سڑکیں ۱۰۹
- (iii) سرکاری ریلوں کی مالی سرگزشت اور سرکاری ریلوں کا مالی تجزیہ ۱۱۰
- (iv) ہندوستانی ریلوں کے پیچیدہ مسئلے ۱۱۲
- (ا) مختلف پٹریوں کا مسئلہ ۱۱۴
- (ب) مختلف ملکیتوں کا مسئلہ ۱۱۴
- (ج) مسافروں کے درجہ داری اعداد ۱۱۵
- (>) ہندوستانی ریلوں میں یورپینوں کی تعداد ۱۱۷



شماریات نقل پزیری

اعداد و شمار کے ذریعے بعض مسئلوں کی توضیح

(i) ابتدائی تقابلی اعداد

ملک کا نام	رقبہ (مربع میل)	ریلیں (میل)	سرطکیں (میل)	کیفیت
امریکہ کی متحدہ ریاستیں	۳۶,۷۵,۸۷	۲,۴۸,۸۲۹	۳۰,۰۹,۰۰۰	آج دنیا میں سب سے زیادہ آباد اور ترقی یافتہ ملک ہے۔
بریزل	۳,۲۷,۵۱۰	۲۰,۹۴۵	۷,۷۸,۰۰۰	بہت بڑا مگر بہت ہی کم آباد ملک ہے۔
ہندستان	۱۵,۷۵,۱۸۷	۴,۰۷,۷۱۰	۳,۰۰,۰۰۰	برما شامل نہیں ہے۔
فرانس	۲,۱۲,۷۵۹	۲۶,۳۸۰	۳,۹۱,۰۰۰	
جرمنی	۱,۸۱,۷۹۹	۳۶,۲۷۱	۱,۳۲,۰۰۰	جنگ سے قبل کے اعداد ہیں
جاپان	۱,۴۷,۵۹۳	۱۴,۷۱۲	۶,۰۱,۰۰۰	
برطانیہ	۲۸,۷۰۰	۲۰,۱۲۱	۱,۷۸,۰۰۰	
ریاست حیدرآباد	۸۲,۷۹۸	۱,۳۶۰	۸,۰۰۰	اندازاً

اس جدول میں جتنے اعداد دیئے گئے ہیں، ان میں یکسانیت کا برقرار رکھنا ناممکن تھا۔ بعض اعداد ایک سنہ سے متعلق ہیں بعض دوسرے سے۔ البتہ کوشش

کی گئی ہو کہ قریب ترین سنہ کے اعداد دیئے جائیں۔ اکثر اعداد ۳۸ء اور ۶۹۳۹ء کی پیمائشیں ایئر لک سے لیے گئے ہیں بعض اعداد گزشتہ یا پچھلے سال کے متعلق ہیں۔

الجھاؤ کے خوف سے نہ تو سنوں کا حوالہ دیا گیا اور نہ اخذوں کا گریب اعداد سرکاری اشاعتوں سے لیے گئے ہیں یا قابل اعتبار کتابوں سے۔ اس پر بھی اعداد کی نوعیت میں اختلاف رہ گیا۔ مثلاً جرمنی کی ریلوں میں چھوٹی پٹری کی ریلیں یا پہاڑی ریلیں BERGBAHNEN شامل نہیں ہیں۔ فرانس کی ریلوں کے بارے میں ماخذ میں لکھا تھا کہ صرف PRINCIPAL یا MAIN LINES

LINES کی لمبائی ۳۸۰ و ۲۶ میل ہو۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان اہم ریلوں کے علاوہ اور کتنی ریلیں ہیں اور ان کی طوالت کیا ہو۔

نوعیت کے اعتبار سے سڑکوں کے اعداد اور بھی مختلف ہیں۔ ہندوستان کی تین لاکھ سڑکوں میں صرف اعلیٰ اور عمدہ سڑکوں کو شامل کیا گیا ہو۔ جب سڑکوں کی نوعیت میں فرق ہو تو ظاہر ہو کہ تقابل قطعی طور پر نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی ان اعداد سے جاپان اور مغربی ملکوں کی عظمت اور ہندوستان کی معاشی پستی ظاہر ہوتی ہو۔

ہندوستان کے اعداد میں حیدرآباد کے اعداد شامل ہیں۔ صرف اردو دانوں کی دل چسپی کے منظر ریاست حیدرآباد کے اعداد علیحدہ بھی دیے گئے ہیں۔

(ii) جدید وضع کی بے گردی سڑکیں

انوس ہو کہ باوجود کوشش اور دریافت کے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مختلف ملکوں میں بے گردی سڑکیں کتنی ہیں؟ روایادیں دیکھیں، فنی کتابوں میں تلاش کیا، انجینروں سے پوچھا، حوالوں کی کتابیں چھان ڈالیں، مگر اطمینان بخش اعداد کہیں نہ ملے۔ آخر ہارمان لی اور کھوج ترک کردی۔ اتنا

ضرور معلوم ہوا کہ متحدہ امریکی ریاستوں میں چھ لاکھ Surfaced Roads ہیں۔ اور ان سطح سڑکوں سے مراد سنا ہو کہ ڈامریا سیمنٹ کی بے گردی سڑکیں ہیں۔ موجودہ جنگ سے قبل دو ایک مرتبہ جرمنی کی Autobahnen.

کے بارے میں پڑھا تھا مگر وہاں کی بھی بے گردی سڑکوں کی مجموعی طوالت معلوم نہ ہو سکی۔ ایک سیاح نے کہا ہو کہ سارے یورپ کی بہترین سڑکیں وہیں کی ہیں اور ”ہزاروں میل“ چلی گئی ہیں۔ ہندوستان کی بابت کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ یہاں بے گردی سڑکوں کی طوالت دس ہزار میل ہو۔ بظاہر یہ صحیح معلوم ہوتی ہو مگر پھر بھی سوچتا ہوں کہ ہمارے اخباروں کا کیا ٹھیک؟

بہر حال بے گردی سڑکوں کے بارے میں بڑے بھلے جو کچھ اعداد ملے یہ ہیں :-
 امریکی متحدہ ریاستیں ۶,۰۰,۰۰۰ میل ہندوستان ۱۰,۰۰۰ میل
 جرمنی ۲۵,۰۰۰ ” حیدر آباد ۵۰ ”

ان اعداد سے بھی مختلف ملکوں کی ترقیوں کا دھندلا سا احساس ممکن ہے۔ امریکہ کی متحدہ ریاستوں میں ایک سمندر کے کنارے سے دوسرے سمندر کے کنارے تک شمالی سرحد سے جنوبی سرحد تک تمام بڑے بڑے شہروں اور منڈیوں کے درمیان پختہ بے گردی سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہو ایک ہی سمت میں تین ہزار میل تک سیمنٹ کی سڑک چلی گئی ہو؟

(iii) سرکاری ریلوں کی مالی سرگزشت

اور

سرکاری ریلوں کا مالی تحزیہ

۱۹۳۹-۴۰ میں سرکاری ریلوں کی لمبائی ۲۹,۷۲۱

۷,۵۹,۰۰۰,۰۰۰	میں لگائے ہوئے سرمائے	"	"	"	"	"
۹۸,۲۹,۰۰۰,۰۰۰	کی خام آمدنی	"	"	"	"	"
۶۴,۸۵,۰۰۰,۰۰۰	ریلیں چلانے کا خرچ	"	"	"	"	"
۳۳,۴۴,۰۰۰,۰۰۰	ریلوں کی خالص آمدنی	"	"	"	"	"
۲۹,۷۱,۰۰۰,۰۰۰	کا سود	"	"	"	"	"
۴,۵۸,۰۰۰,۰۰۰	زائد					

اس جدول سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریلوں پر کسی قسم کی مالی ذمہ داری نہیں رہی کیونکہ سوا چار کروڑ سے زائد ہی ان کی آمدنی تھی مگر حقیقتہً اس کے خلاف ہے کیونکہ ۱۹۲۷ء کے سمجھوتے کے مطابق سرکاری ریلوں پر واجب ہے کہ تجارتی ریلوں کی کل لاگت کا ایک فی صدی (فوجی ریلوں کے نقصان کی تلافی کے بعد) عام اخراجات کے لیے دیں اس کے بعد بھی اگر زائد منافع بچت رہے تو ۱/۱۰ حصہ عام اخراجات دینا ریلوں پر ضروری قرار دیا گیا تھا ان شرائط کے مطابق

۹۷,۰۴۵	-	۱۵ ٹرانک کی خام وصولی
۰,۶۴	-	متفرق ذریعوں سے خالص وصولی
۹۸,۰۲۹	-	خام آمدنی

سلسلہ ۱۹۳۹-۳۸ میں ریلوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ چار کروڑ ۶۳ لاکھ ادا کریں مگر ان کی مزید آمدنی ہی چار کروڑ ۳۳ لاکھ تھی لہذا وہ صرف یہی رقم ادا کر سکے اور ان کے ذمے ۲۰ لاکھ باقی ہوئے سلسلہ ۱۹۳۸-۳۹ کے متعلق تفصیلی اعداد معلوم ہوئے ہیں جس سے ۱۹۳۹ کے سمجھوتے کی وضاحت ہوتی ہے۔

سلسلہ ۱۹۳۸-۳۹ میں تجارتی ریلوں کی کل لاگت تھی ۶,۹۱,۲۳,۰۰۰ روپے

اس رقم کا ایک فی صد ہوا ۶,۹۱,۲۳,۰۰۰

فوجی ریلوں کو چلانے کا نقصان (مہنہ طلب) ۲,۴۵,۹۷,۰۰۰

باقی (عام اخراجات کے لیے ادا طلب) ۴,۴۵,۲۶,۰۰۰

سلسلہ ۱۹۳۷ کے سمجھوتے کے مطابق یہ رقم ریلوں کی طرف سے مرکزی حکومت

ہند کے عام اخراجات کے لیے ادا طلب تھی مگر اس ہمس میں ریلوں کو

کل بچت ہی ۱,۳۷,۰۰۰,۰۰۰ روپے

کی ہوئی تھی لہذا ریلوں نے سلسلہ ۱۹۳۸-۳۹ میں ۴,۴۵,۲۶,۰۰۰ روپے

کرنے کی بجائے صرف ۱,۳۷,۰۰۰,۰۰۰ روپے

کیا تھا اور ان پر بقیہ رقم ادا کرنے کا بار باقی ہے۔ یعنی ۳,۰۸,۲۶,۰۰۰

ریلوں سے نہ صرف یہ رقم وصول طلب ہے بلکہ گزشتہ سالوں کا بقایا بھی ان

پر باقی ہے چنانچہ ریلوے بورڈ نے جو سرکاری رویداد شائع کی ہے اس میں گزشتہ

سالوں کے بقایا کی تفصیل درج ہے۔

۱۹۳۱-۳۲ میں غیر ادا شدہ رقم ۵,۳۶,۰۰۰,۰۰۰

۱۹۳۲-۳۳ " " " " " ۵,۲۳,۰۰۰,۰۰۰

۱۹۳۳-۳۴ " " " " " ۵,۲۱,۰۰۰,۰۰۰

۱۹۳۴-۳۵ " " " " " ۵,۰۴,۰۰۰,۰۰۰

۴,۹۹,۰۰,۰۰۰	میں غیر ادا شدہ رقم	۱۹۳۵-۳۶
۴,۹۱,۰۰,۰۰۰	" " " "	۱۹۳۶-۳۷
۱,۵۸,۰۰,۰۰۰	" " " "	۱۹۳۷-۳۸
۳,۰۵,۰۰,۰۰۰	" " " "	۱۹۳۸-۳۹
۳,۰۰,۰۰,۰۰۰	" " " "	۱۹۳۹-۴۰
۳۵,۶۷,۰۰,۰۰۰	۱۹۳۱-۳۲ سے ۱۹۳۹-۴۰ تک کی میزان	

ریلوں کی مالی درگت کا اندازہ انھیں ۳۵ کروڑ ۶۷ لاکھ کے بعد سے نہیں ہوتا کیونکہ ریلوں نے مطالبات فرسودگی کی مد سے بھی قرض لے رکھا ہو جس کی ادائی ضروری ہو کیونکہ جب کبھی نئی تعمیر کی ضرورت ہوگی یا بڑی بڑی قیمتی مشینیں خریدنی پڑیں گی تب مطالبات فرسودگی کی ندیں عدم گنجائش کی وجہ سے بڑی خرابی اور پریشانی ہوگی۔ مطالبات فرسودگی کے مد سے جس قدر ریلوں نے قرض لیا ہو اس کی تفصیل کئی سرکاری رویدادوں میں درج ہو جس سے پتہ چلتا ہو کہ ریلوں نے مطالبات فرسودگی کی مد سے حسب ذیل رقمیں بطور قرض وصول کی ہیں جن کی ادائی بھی بہر حال کبھی نہ کبھی لازمی ہو :-

۴,۲۵,۰۰,۰۰۰	۱۹۳۱-۳۲
۱۰,۲۳,۰۰,۰۰۰	۱۹۳۲-۳۳
۷,۹۶,۰۰,۰۰۰	۱۹۳۳-۳۴
۵,۰۶,۰۰,۰۰۰	۱۹۳۴-۳۵

۱۹۳۵-۳۶

۴۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

۱۹۳۱-۳۲ سے ۱۹۳۵-۳۶ تک حاصل کی ہوئی رقم ۳۱۵۰۰۰۰۰۰۰۰۰

ریلوں پر کل بار

۱۹۲۲ء کے سمجھوتے کے تحت ۱۹۳۱-۳۲ سے ۱۹۳۹-۴۰ تک

۳۵۰۶۷۰۰۰۰۰۰۰۰

ادا طلب رقم

۱۹۳۱-۳۲ سے ۱۹۳۵-۳۶ تک مطالبات فرسودگی سے حاصل کردہ ۳۱۶۵۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

۶۷۰۱۷۰۰۰۰۰۰۰۰

کل بار



(۱۷) ہندوستانی ریلوں کے پیچیدہ مسئلے

(۱) مختلف پٹریوں کا مسئلہ

امریکہ، جاپان، فرانس وغیرہ میں ریلوں کی یکسانیت اور انتظامی سادگی قابلِ شک ہو سب ریلیں یا تو حکومت کی ملک ہیں یا خانگی کمپنیوں کی۔ سب ریلیں یکساں جوڑی ہیں۔ بڑی پٹری منھولی پٹری کی..... تکلیف دہ تفریق نہیں ہو۔ سب ریلیں ایک ہی انتظامی مسلک یا اقتدار کے تحت یکسانیت اور ہم آہنگی سے ساری قوم اور ملک کے فائدے کے لیے چل رہی ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان میں ریلوں کا مسئلہ ایک گورکھ دھندا ہو۔ ہندوستان کے ریلوے کے مسئلے کو سمجھنا بھول بھلیوں کو پار کرنا ہو۔ سب سے پہلے ریلوں کی پٹریاں مختلف ہیں کہیں بڑی پٹری کی ریل ہو، کہیں اوسط یا منھولی پٹری اور کہیں چھوٹی پٹری، کم آباد علاقوں کے لیے ممکن ہو ضروری تصور کی جائے مگر بڑی اور منھولی پٹریوں کی وجہ سے اب بہت تکلیف ہو رہی ہو۔

ان اعداد کو دیکھیے اور دو علمی کی جھنجھٹ کا خیال کیجیے :-

ہندوستان میں بڑی پٹری (۵ فٹ ۶ انچ) کی لمبائی	۲۱،۱۹۷ میل
منھولی پٹری (۳ فٹ ۳ ۱/۲ انچ) " " " "	۱۵،۷۵۷ " "
چھوٹی پٹریوں (۲ یا ۲ ۱/۲ فٹ) " " " "	۴،۱۲۲ " "
کل لمبائی	۳۱،۰۷۶

یہ ماننا پڑے گا کہ اکثر ملکوں کی طرح کم آباد اور کم زرخیز علاقوں میں چھوٹی پٹری کی ریلوں کی ضرورت ہوتی ہو، مگر منھولی پٹری سے بڑی کو نت ہونے لگی ہو۔

سج، ی: ”ہنگا پھٹتائے ایک بار، سستا پھٹتائے بار بار!“

(ب) مختلف ملکیتوں یا انتظاموں کا مسئلہ

- (۱) حکومت ہند کی ریلیں جو سرکاری انتظام میں چل رہی ہیں۔ ۱۵،۶۷۷-۱۵۰۰ میل
- (۲) ” ” ” جنھیں خانگی کمپنیاں چلا رہی ہیں۔ ۱۳،۰۳۶-۱۳۰۰ ”
- (۳) مختلف خانگی کمپنیوں کی ریلیں جو سرکاری ضمانت، سرکاری امداد سے یا سرکار کے انتظام میں چل رہی ہیں۔ ۳،۶۷۹-۳۰۰ ”
- (۴) ڈسٹرکٹ (ضلع داری) بورڈ کی ریلیں ۱۳۶
- (۵) ڈسٹرکٹ (ضلع داری) بورڈ سے امداد پانے والی خانگی ریلیں ۲۹۹-۲۰۰ ”
- (۶) دیسی ریاستوں کی ریلیں جو دیسی ریاستوں کے انتظام میں چل رہی ہیں۔ ۵،۵۵۲-۵۰۰ ”
- (۷) دیسی ریاستوں کی ریلیں جن کا انتظام مرکزی حکومت ہند یا خانگی کمپنیاں کر رہی ہیں۔ ۱،۴۷۸-۱۰۰ ”
- (۸) خانگی کمپنیوں کی ریلیں جنھیں کہیں سے امداد نہیں ملتی اور اپنے بل بوتے پر چل رہی ہیں۔ صرف! ۱۲۷-۱۰۰ ”

ہندستان کی پہلی ریل ضمانت کے تحت جاری کی گئی تھی حکومت ہند نے خانگی کمپنیوں سے معاہدہ کیا تھا کہ چاہے کچھ ہو کم سے کم ۵ فی صدی منافع ملے گا۔ آج بھی ہندستان کی ریلیں یہ حقیقت ظاہر کرتی ہیں کہ تجارتی اور لوہاری کا شور بہت ہی ضمانت یا امداد پا کر دوبار چلانا کیا مشکل ہو؟

(ج) مختلف درجوں کے تقابلی اعداد

ہندستان کی ریلیں میں مسافروں کی درجہ داری تعداد حالت کیفیت تیسرے درجے کے مسافر (پچاس کروڑ سے زیادہ) ۵۰،۵۳،۴۷۰،۰۰۰

ڈیوڑھے درجے کے مسافر (ایک کروڑ سے زیادہ) ۱۳۶۲۴۰۰۰
 دوسرے " " " (آدھے کروڑ سے زیادہ) ۴۲۰۱۷۰۰۰
 پہلے " " " (چار لاکھ سے بھی کم!) ۳۰۹۷۰۰۰
 مسافروں کی یہ تعداد ۱۹۲۷-۲۸ء سے متعلق ہے۔ گزشتہ برسوں میں بھی مختلف درجوں کے مسافروں کی تقریباً یہی تعداد رہی تھی۔ انہیں اعداد کو دوسرے طریقے سے ظاہر کرنے کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فی ہزار مسافر مختلف درجوں میں سفر کرنے والوں کی یہ تعداد تھی :-

تیسرے درجے کے مسافر	۹۰۷۰۰
ڈیوڑھے " " "	۲۰۲
دوسرے " " "	۹۰
پہلے " " "	۸

نہ صرف تعدادی نقطہ نظر سے بلکہ آمدنی کے لحاظ سے بھی تیسرے درجے کے مسافروں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ۱۹۳۸-۳۹ء کی ریلوے رویداد میں لکھا ہے کہ آمدورفت سے اس سلسلہ میں کل ۳۰ کروڑ وصول ہوئے تھے۔ درجہ داری اعتبار سے یہ رقم اس طرح وصول ہوئی تھی :-

تیسرے درجے کے مسافروں سے	۲۷۰۳۴۰۰۰ روپیہ
ڈیوڑھے " " "	۱۰۲۳۰۰۰۰
دوسرے " " "	۱۰۳۹۰۰۰
پہلے " " "	۷۷۰۰۰

تمام مسافروں سے ۳۰۷۴۳۰۰۰

درجہ داری آمدنی کی اہمیت اس طرح بھی ظاہر کی جاسکتی ہے۔ ہر تلو روپیوں

میں سے

تیسرے درجہ کے مسافروں سے ۸۹-۳-۰ - پائی وصول ہوتے ہیں۔

ڈیوڑھے " " " " ۸-۲-۴ " " " "

دوسرے " " " " ۲-۵-۴ " " " "

پہلے " " " " ۲-۵-۲ " " " "

غرض تعدادی اور رفتی دونوں اعتبار سے تیسرے درجے کی اس قدر اہمیت

ہی کہ اس کو نظر انداز کر کے اپنی تمام تر توجہ بڑے درجوں پر مبذول کرنا صرف شاہی

اور پرنسپل راج میں ممکن ہی۔ ورنہ یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ کم آمدنی دینے

والوں پر تو عنایتیں ہوں اور ۹۰ فی صدی آمدنی دینے والوں کے ساتھ بے توجہی

کی جائے تیسرے درجوں میں بہت بھیڑ ہوتی ہی، صفائی کا بہت کم خیال رکھا جاتا

ہی، بیت الخلا ناکافی تعداد میں ہوتے ہیں، بہترے اسٹیشنوں پر پانی ناکافی

ہوتا ہی، کئی اسٹیشنوں پر ٹکٹ عین اس وقت بٹتے ہیں جب گاڑی آتی ہوئی دکھائی

دیتی ہی..... بڑے بڑے اسٹیشنوں پر بھی ڈھنگ کی کوئی جگہ نہیں ہوتی جہاں

تیسرے درجے کے مسافر چین سے انتظار کر سکتے ہوں، ان سب پر یہ کہ ریلوے کے

گلیا عہدہ دار تیسرے درجے والوں کے ساتھ بڑا برتاؤ کرتے ہیں۔ اگرچہ پبلک

ہنگاموں اور اخباروں کے اعتراضوں کی وجہ سے حالت بہتر ہو رہی ہو مگر پھر بھی

تمام گورے اور کالے صاحبوں کی صاحبیت ان کے دماغ خراب کر دیتی ہو اور

ان کا بے جا غصہ اور چڑچڑاپن تیسرے درجے کے مسافروں پر ختم ہوتا ہو۔

(د) ہندوستانی ریلوں میں یورپیوں کی تعداد

سنہ ۳۰ - ۱۹۲۹ ۴, ۹۸۱
۳۱ - ۱۹۳۰ ۴, ۷۷۳
۳۲ - ۱۹۳۱ ۴, ۵۳۲
۳۳ - ۱۹۳۲ ۴, ۳۱۲
۳۴ - ۱۹۳۳ ۳, ۹۰۶
۳۵ - ۱۹۳۴ ۳, ۵۲۵
۳۶ - ۱۹۳۵ ۳, ۱۱۲
۳۷ - ۱۹۳۶ ۲, ۹۴۸
۳۸ - ۱۹۳۷ ۲, ۶۹۲

ان اعداد کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستانی ریلوں میں جو یورپی افراد تھے ان کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ پھر بھی ہندوستانیوں کا یہ مطالبہ بڑھ رہا ہے کہ ہندوستانی ریلوے ملازمت کو ”ہندیانا“ چاہیے۔ یعنی اور زیادہ تعداد میں ہندوستانیوں کا تقرر اعلیٰ فنی اور انتظامی عہدوں پر کیا جانا چاہیے۔ ہندوستانیوں کی اصل شکایت یہ ہے کہ ریلوے میں تقرر اور ترقی کے موقع پر رنگ روپ، نسلیت اور قومیت کو بہت دخل ہوتا ہے۔

جس قدر زیادہ ہندوستانی اپنے حقوق کے لیے کوشش کر رہے ہیں اور اپنے ہی وطن میں انصاف اور مساوات حاصل کرنے کے لیے قربانیاں کر رہے ہیں اسی قدر ریلوے کی ملازمت میں ان کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ یہ ادربات ہے کہ قربانی کوئی کر رہا ہے اور ان کا پھل کسی اور کو مل رہا ہے آخر یہ دنیا ہے۔ سدا سے یہاں کا یہی رنگ ہے۔

ضمیمے

(i) جدید ذرائع نقل پذیری کی تاریخی سرگزشت ۱۲۱

۱۲۵

(ii) ریلوے ادب

پہلا ضمیمہ :-

جدید ذرائع نقل پذیری کی تاریخی سرگزشت

- ۱۷۸۰ء بھاپ کی قوت دریافت ہوئی۔
- ۱۷۸۳ء پانی کھینچنے کا پمپ بنایا گیا۔
- ۱۷۸۴ء رومی کی گرنی میں بھاپ سے چلنے والا انجن استعمال ہوا۔ یہ انجن واٹ Watt نے بنایا تھا۔
- ۱۷۸۵ء دخانی جہاز بنانے کے تجربے شروع ہوئے۔ فنج Finch نے ابتدائی دشواریاں حل کیں۔
- ۱۷۹۳ء فلٹن Fulton نے دخانی جہاز کو سہولت اور کامیابی سے چلانے کی ایجاد کی۔
- ۱۸۰۳ء تروی متھک Trevithick نے خود متحرک انجن بنایا۔
- ۱۸۰۷ء فلٹن Fulton کا بنایا ہوا اور بھاپ کی قوت سے چلنے والا جہاز کلیرمون Olermont ہڈسن ندی پر آمدورفت کے لیے باقاعدہ طور پر چلایا گیا۔
- ۱۸۱۹ء امریکہ کے بنے ہوئے ساونا Savannah نامی دخانی جہاز نے سب سے پہلی مرتبہ بحر اوقیانوس کو پار کیا۔ امریکہ سے یورپ تک سمندر کو عبور کرنے میں ۲۶ دن لگے تھے۔
- ۱۸۲۴ء خود متحرک انجنوں کے تجربے کامیاب ہونے لگے۔
- ۱۸۲۵ء ریل کی ایجاد ہوئی۔
- ۱۸۲۹ء انسابطہ طور پر لورپول اور مانچسٹر کے درمیان ریل جاری ہوئی اور ٹی فون بن

کے ایجاد کردہ ایجن راکٹ Rocket. نے (۱۳ اٹن کا وزن کھینچتے ہوئے) ۴۴ میل فی گھنٹہ کی انتہائی رفتار حاصل کی !

۱۸۳۵ مائرس Mores. نے برقی تار کے ذریعے پیام رسانی کا طریقہ معلوم اور ایجاد کیا۔

۱۸۴۳ شولز Sholes. نے ٹائپ نویسی کی مشین ایجاد کی۔

۱۸۴۶ بل Bell. نے ٹیلیفون ایجاد کیا۔

۱۸۴۷ ایڈسن Edison. نے گراموفون ایجاد کیا۔

۱۸۴۹ سائیکل کی ایجاد

۱۸۸۳ ٹریم گاڑیوں کا رواج ہوا۔

۱۸۸۴ ڈیملر Daimler. نے پٹرول سے چلنے والی موٹر کار ایجاد کی۔

۱۸۸۵ سائیکلوں کا رواج بڑھنے لگا اور سائیکلیں قیمت کے اعتبار سے سب

سے زیادہ سستی اور استعمال کے لیے سب سے کم خرچ ذریعہ ثابت ہوئیں۔

۱۸۹۳ ایڈسن Edison. نے متحرک تصویروں کو مسلسل پیش کرنے میں کامیابی

حاصل کی یعنی سینما کی ایجاد ہوئی۔

۱۸۹۵ فرانس میں موٹروں کا رواج بڑھنے لگا۔

۱۸۹۶ مارکونی Marconi. نے بے تار پیام رسانی کا طریقہ معلوم کیا۔

۱۹۰۳ رائٹ Wright. نامی دو بھائیوں نے ہوائی جہاز کی ایجاد کی۔

دلبر رائٹ Wilbur Wright. نے ”پرندہ انسان“ کا

لقب حاصل کیا۔

۱۹۰۴ موٹروں کا رواج عام ہوتا گیا۔

- ۱۹۰۷ برقی انجنوں کی ایجاد ہوئی۔
- ۱۹۰۹ فرانس کے باشندے بلیر Bleriot نے سب سے پہلے انگلش چینل کو ہوائی جہاز میں عبور کیا گویا فرانس اور انگلستان کے درمیان ۲۵ میل کا سمندری راستہ بالا بالا ہی طے ہوا!!
- ۱۹۱۲ برقی انجنوں کی ایجاد ہوئی۔
- ۱۹۱۵ ہوائی جہاز کا استعمال جنگ میں بڑھنے لگا۔ ہوائی بم باری اور فضائی جنگ کی وجہ سے نئے نئے خطرے نمودار ہوئے۔
- ۱۹۱۹ موٹر دوس کا عام رواج ہوتا گیا۔ بحراوقیانوس کو لفٹنٹ ریڈ Read نے ہوائی جہاز کے ذریعے عبور کیا۔
- ۱۹۲۰ انتہائی آرام اور آسائش کے جہاز بننے لگے۔ آمد و رفت کے لیے ہوائی سروس امریکہ اور یورپ میں جا بجا قائم کی گئی۔
- ۱۹۲۳ تیز جہازوں نے بحراوقیانوس کو ۱۲ دن میں عبور کرنا شروع کیا۔
- ۱۹۲۵ انتہائی آرام اور آسائش کے ہوائی جہاز بننا شروع ہوئے۔
- ۱۹۲۶ بڑے بڑے تعیشاتی جہاز بننے لگے۔ تیز و جہازوں نے بحراوقیانوس کو ۱۲ دن میں عبور کرنا شروع کیا۔ امریکہ اور یورپ کے درمیان فزوں کو لانے لے جانے والے جہاز دراصل "تیرنے والے عمل میں ہر تکلف اور آرام بخش۔
- ۱۹۲۹ "گراف زیپلین" Graf Zeppelin نامی ہوائی جہاز نے بین برعظمیٰ اور عالمی سفر کر کے دنیا کو ششدر کر دیا۔
- ۱۹۳۶ سر ماک کمبل Sir M. Campbell نے بلو برڈ Blue Bird نامی موٹر میں دسے تو نا Daytona (امریکہ) کے ساحل پر ۲۵ میل

فی گھنٹہ کی رفتار حاصل کر کے موٹر رانی کا رکاڈ قائم کیا۔ اور اسی سال ”کوین میری“ نامی جہاز نے بحر اقیانوس کو (۳۰ ناٹ کا رکاڈ حاصل کر کے) کم ترین وقت میں عبور کیا۔

۱۹۳۹ جنگ میں فوجی نقل و حرکت زیادہ تر موٹروں اور جنگی ٹینکوں کے ذریعے ہونے لگی ”گھوڑے اور خچر کے دن نہیں رہی!“

۱۹۴۰ فضائی جنگ کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اس کی وجہ سے یورپ کا سیاسی نقشہ بدل گیا۔

۱۹۴۱ خطرناک موقعوں پر انسان کو ذاتی حفاظت کے لیے سرنگوں اور زمین دزد پناگا ہوں میں رہنا پڑ رہا ہے۔ انسان نے پروانہ کرنا تو سیکھ لیا مگر خود ————— تہ زمین پہنچ گیا ہے



ریلوے ادب



حوالے کی کتابیں اور سرکاری اشاعتیں

1. "The Statesman's Year Book" 1939, Mac millan, London, 1939.

سالانہ اشاعت ہے؛ بین قومی حوالوں اور ملکوں کے بارے میں عام معلومات حاصل کرنے کی بہترین کتاب ہے۔

2. "Statistical Abstracts for British India" 1928-29 to 1937-38, Govt. of India, Delhi, 1940.

سالانہ سرکاری اشاعت ہے۔ اس میں نہ صرف برطانوی ہند کے متعلق گزشتہ دس سال کے اعداد دیے جاتے ہیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو تاہی ہندوستانی ریاستوں اور کل ہند اعداد بھی ہوتے ہیں۔ مسئلہ ۶ میں برما کی علیحدگی کے بعد سے اعداد میں بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس لیے احتیاط بہت ضروری ہے۔

3. "The Indian Year Book 1940-41", The Times of India 1940. Bombar

سالانہ اشاعت ہے۔ بین صوبہ داری اور بین ریاستی اعداد اور حوالوں اور ضروری تشریح کے لیے مفید کتاب ہے مگر بالکل غیر جانب دار بھی نہیں۔

4. "Report by the Railway Board on Indian Railways for 1939-40", 2 vols., Govt. of India, Delhi, 1941.

اس سالانہ رویداد میں ہندستان کی تمام ریلوں خاص کر سرکاری ریلوں کے بارے میں تفصیلی تشریح اور اعداد ہوتے ہیں۔ جدولیں نقشے، تصویریں اور تقابلی اعداد بھی کافی ہوتے ہیں۔

5. "Road Development Committee Report", Govt. of India, 1928.
6. "Mitchell-Kirkness Committee Report", Govt. of India, Delhi, 1933.
7. "Report of the Indian Railway Enquiry Committee" Govt. of India, 1937.
8. "Budget for 1940-41", Govt. of India, Delhi, 1940.

کتابیں :-

9. G. W. MacGeorge : "Ways & Works in India, Constable, London, 1894.

پرانی ہونے کے باوجود یہ کتاب قابل لحاظ ہے۔ ریلوں کی ابتدائی تاریخ بہت اچھی طرح بیان کی گئی ہے۔

10. K. T. Shah : "Trade, Transport & Tariffs in India", King, London, 1923.

اس مشہور کتاب میں پروفیسر شانے جس آزادانہ طریقے پر ریلوں کی پسپی پر تبصرہ کیا ہے وہ علمی اور قومی دونوں اعتبار سے قابل قدر ہے۔ البتہ کتاب پُرانی ہو گئی ہے۔

11. H. M. Jagtiani : "The Role of the State in the provision of Railways", King, London, 1924.

12. C. S. Ghose: "Indian Railway Economics", 3 vols., Calcutta University, 1927.
13. N. B. Mehta: "Indian Railways: Rates & Regulations", King, London, 1927.
14. K. C. Srinivasan: "The Law & Theory of Railway Freight Rates", Paul, Madras, 1928.
15. N. Sanyal: "Development of Indian Railways," Calcutta University, 1930.
16. R. D. Tiwari: "Railway Rates in Relation to Trade and Industry in India", Longmans, Green & Co., Calcutta, 1937.
17. Dr. Shiv Narain: "Electric Railways in India", Poona, 1940.

جدید اشاعت ہونے اور خاص کڑبجلی کی ریلوں کے متعلق ہونے کی وجہ سے یہ کتاب قابل لحاظ ہے۔ فنی تفصیل بھی موجود ہے۔

18. Dr. Sir Ziauddin Ahmed: "Indian Railways", Lahore, 1940.

ہندستانی ریلوں کے مختلف مسئلوں پر تبصرہ کرنے کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں غیر ملکوں کی مختصر تاریخ اور موجودہ کیفیت پیش کی ہے۔ اگرچہ کتاب معمولی معیار کی ہے، اعداد و شمار کی بھی بعض غلطیاں ہیں، مگر ریلوں کے بارے میں جدید زمانے کی اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ملتی۔ ساہا سال سے ڈاکٹر صاحب اپنی توجہ ریلوں کی طرف مبذول کر رہے ہیں۔ انھیں غیر ملکوں میں سفر کر کے تقابل اور مشاہدے سے نئی باتیں معلوم کرنے کا موقع ملا ہے۔ اسی کی وجہ سے کتاب قابل قدر ہے۔

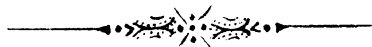
مضمون :-

1. L. C. Tandon: "A Critical Survey of Railway finance in India".
Indian Journal of Economics, Allahabad October 1937.

2. B. Mukerjee : " The Transport problem in India ". Ind. Jour. Ec., April 1937.
3. R. Ahmed : " Road--Rail Competition on the B. N. W. Ry. "
4. Habeebur Rehman : " An Experiment in the Co-ordination of Rail and Road Transport. " Indian Journal of Economics, April 1937.

متذکرہ مضامین کے علاوہ بھی انگریزی کے مستند رسالوں میں کئی مضمون ریلوے کے متعلق شائع ہو چکے ہیں۔

مندرجہ مضمون میں خاص کر ٹنڈن صاحب اور حبیب الرحمن کے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔



ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولہویں تاریخ شائع ہوتا ہے۔
تعم ۱۶ صفحات - قطع ۱۶x۲۴ - چند سالانہ ایک روپیہ قیمت فی پرچہ ایک

اُردو

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جنوری - اپریل - جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے

اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے، تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اردو میں ہونے میں شائع ہوتی ہیں، ان پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے، قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپی سکھ انگریزی (اٹھ روپی سکھ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (دو روپی سکھ عثمانیہ)۔

رسالہ سائنس

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

(ہر انگریزی تاریخ کی پہلی تاریخ کو جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے شائع ہوتا ہے)

اس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دالوں میں مقبول کیا جائے دنیا میں سائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں یا جو بحثیں یا ایجادیں ہو رہی ہیں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ رسالے میں متعدد ہلاک بھی شائع ہوا کرتے ہیں۔ قیمت سالانہ صرف پانچ روپی سکھ انگریزی (پچھو روپی سکھ عثمانیہ)۔

خط و کتابت کا پتہ: - مستند مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن۔

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

عام پسند سلسلہ

اُردو زبان کی ترقی و اشاعت کے لیے بہت دنوں سے یہ ضروری خیال کیا جا رہا تھا کہ سلیس عبارت میں مفید اور دل چسپ کتابیں مختصر حجم اور کم قیمت کی بڑی تعداد میں شائع کی جائیں۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اسی ضرورت کے تحت عام پسند سلسلہ شروع کیا ہے اور اس سلسلے کی پہلی کتاب ہماری قومی زبان ہے، جو اُردو کے ایک بڑے محسن اور انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر جناب ڈاکٹر سرتیج بہادر سپرو کی چند تقریروں اور تحریروں پر مشتمل ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ واقعی عام پسند ثابت ہوگا اور اُردو کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو کر رہے گی۔ قیمت ۸/-

ہمارا رسم الخط

از جناب عبد القدوس صاحب پٹنہ

رسم الخط پر علمی بحث کی گئی اور تحقیق و دلیل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے لیے اُردو رسم الخط مناسب ترین اور ضروری ہے۔ گیارہ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر طلب کیجیے۔

مینجر انجمن ترقی اُردو (ہند) علی دریا گنج۔ دہلی

